قرآن اور اعتراضات

کے جوابات

جوابات از

علمائے قم و نجف

مرتبہ

مجاہد حسین حرؔ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔

نام کتاب.. قرآن اور اعتراضات کے جوابات

جوابات از.. علمائے قم و نجف

مرتبہ .... مجاہد حسین حرؔ

پروف ریڈنگ .... خانم شازیہ غضنفر

کمپوزنگ .... قائم گرافکس ۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس فیز ۴

ناشر .... مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ...

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

03214971214،04237361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

03335234311

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم و تفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی انشاء اللہ العزیز شائع کی جاتی رہے گی۔

موجودہ کتاب "قرآن اور اعتراضات کے جوابات" قرآنی معرفت کا ایک سلسلہ ہے۔ قرآن مجید سے شغف رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک مفید تحفہ ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطلع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکرگزار ہوں گے۔ ادارہ کے ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست کتاب

کیا قرآن مجید کی ہدایت صرف متقین کے لئے ہے اور کیا اس صورت میں دور
کی مشکل پیش نہیں آتی ہے؟ 7
خداوند متعال نے کیوں فرمایا ہے: ان مع العسر یسرا اور یہ نہیں فرمایا ہے
کہ: ان بعد العسر یسرا؟ 14
قرآن مجید کے سورہ نحل کی آیت نمبر ۴۸ میں کیوں شمائل کو جمع لایا گیا ہے جبکہ
یمین کو مفرد لایا گیا ہے؟ 18
سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۵۴ کے مطابق اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے
پیرو قیامت تک کفار پر برتری رکھتے ہیں، تو کیا ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین
کو قبول کرنا چاہئے تا کہ قیامت تک تمام کفار سے برتر رہیں؟ 22
کیا قرآن مجید میں عورتوں پر مردوں کی برتری جتلانا عورتوں کی بے احترامی اور
مردوں کے لئے فخر و مباہات کا سبب نہیں ہوتا ہے؟ 29
سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۳ اور سورہ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ کے درمیان پائے
جانے والے اختلاف کی کیسے توجیہ کی جاسکتی ہے؟ 39

سورہ مومنون کی آیت نمبر ۱۰۱ اور سورہ صافات کی آیت نمبر ۲۷ اور ۵۰ کے
درمیان پائے جانے والے تناقض کو کیسے برطرف کیا جا سکتا ہے؟ 46
کیا بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی سزا عاقلانہ تھی؟ 53
خداوند متعال نے کیوں زیادہ تر مادی نعمتوں سے بہشت کی توصیف کی ہے؟ 59
یہ دیکھتے ہوئے کہ خدا نظر نہیں آتا سورہ مطففین کی آیت نمبر ۱۵ "كَلَّآ اِنَّهُمۡ
عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ" کی کیسے تفسیر کی جا سکتی ہے 62
کیا وَالسّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِيۡنَ وَالۡاَنۡصَارِ ..." امام علیؑ کی شان
میں نازل ہوئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو صیغہ جمع کے، ایک فرد کے لئے استعمال
ہونے کی کیسے توجیہ کی جا سکتی ہے؟ 64
کیوں قرآن کی بعض آیتیں انبیاء کی عصمت کے منافی ہیں؟ براہ کرم واضح
کیجئے۔ 76
مفسرین کرام نے کلمہ "واضربوھن" (عورتوں کو مارو) کو آیہ نشوز میں کس طرح
تفسیر کرتے ہیں اور اسکی کیا وجہ بتاتے ہیں؟ 79
قرآن لوگوں کو کیوں افسانوی جانوروں سے ڈراتا ہے تا کہ وہ واجبات پر عمل
کریں؟ 87
ایسا قرآن کس طرح ہمیشہ کے لئے رہنما ہو سکتا ہے جس کی آیتیں خود اسی کی
دوسری آیتوں کی نفی و ترمیم کرتی ہوں؟ 89
قرآن مجید کیوں آیہ، آیہ کی صورت میں ہے؟ قرآن مجید کے سوروں میں سے کو
نسا سورہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یکبارگی نازل ہوا ہے؟ 97
قرآن مجید، اعراب کے بغیر کیسے تحریف سے محفوظ رہا ہے؟ 104

صرف چند انبیاء علیہم السلام کے نام قرآن مجید میں ذکر ہونے کی کیا وجہ ہے؟ 109
سورہ بقرہ آیت نمبر 228 میں مرد کے لئے عورت پر برتری کا اعلان ہوا ہے کیا یہ
خداوند عالم کے عادل ہونے کے خلاف نہیں ہے؟ 115
قرآن عربی زبان میں کیوں ہے کسی اور زبان میں کیوں نہیں؟ 119
قرآن مجید کے مطابق خاندان میں مردوں کی عورتوں پر نگرانی کی کیا توجیہ ہے؟ 125
جس قرآن نے اپنے نزول کے 23 سال کے اندر ہی اپنی آیتوں کی نفی وترمیم
کی ہو وہ کس طرح ہمیشہ کے لئے انسان کا راہنما ہوسکتا ہے؟ 134

کیا قرآن مجید کی ہدایت صرف متقین کے لئے ہے اور کیا اس صورت میں دور کی مشکل پیش نہیں آتی ہے؟

قرآن مجید میں مسلسل یہ تاکید کی جارہی ہے کہ آیات الٰہی صرف ان لوگوں کے لئے ہیں، جو متقی ہیں اور غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔۔۔لیکن متقی بننے اور غیب پر ایمان لانے کے لئے قرآن مجید کو قبول کرنے کی ضرورت ہے، کیا اس طرح دور کی مشکل پیش نہیں آتی ہے؟

مختصر جواب

جہاں پر قرآن مجید میں متقین کی ہدایت کے لئے آیات موجود ہیں، وہاں اور بھی آیات پائی جاتی ہیں جن میں آسمانی کتابوں اور قرآن مجید کو عام لوگوں کی ہدایت کے لئے بیان کیا گیا ہے اور صرف مومنین کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ عام ہدایت کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے: ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے، جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور حق و باطل کے امتیاز کی واضح نشانیاں موجود ہیں۔ اس قسم کی آیات سے مجموعی طور پر یوں استفادہ ہوتا ہے کہ آسمانی کتابوں، خاص کر قرآن مجید کے ہدایت کنندہ ہونے کے بارے میں دو طرح ذکر کیا گیا ہے: اول: تمام دنیا والوں کی ہدایت اور بیداری، دوم: متقین کی ہدایت۔

متقین کی ہدایت کے بارے میں بھی ایک ہدایت ابتدائی ہے، اس ہدایت سے پہلے قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری ہے، بلکہ صرف ایک صحیح ،سالم اور پاک فطرت کا ہونا کافی ہے اور دوسری ہدایت خودقرآن مجید کے ذریعہ اور پہلی ہدایت کے ذیل میں ہے۔ اس طرح دور کی مشکل حل ہوتی ہے۔

تفصیلی جواب

قرآن مجید کی متعدد آیات میں، اس مقدس[1] کتاب کی ہدایت کومتقین سے مخصوص بیان کیا گیا ہے،[2] اس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن مجید کا کام ہدایت کرنا ہے، متقین تو ہدایت یافتہ ہوتے ہیں اور اس طرح ہدایت شدہ لوگوں کی ہدایت کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ قرآن مجید اس وقت ہدایت کی کتاب ہے کہ جب غیر متقین کی بھی ہدایت کرے۔

اس شبہ کے جواب کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل مقدمہ پر غور کرنا ضروری ہے:

الف: بعض ان آیات کا وجود جو قرآن مجید کے تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہونا بیان کرتی ہیں۔

اس قسم کی آیات کے مقابلے میں، قرآن مجید میں کچھ دوسری قسم کی آیات بھی پائی جاتی ہیں، جو آسمانی کتابوں، خاص کر قرآن مجید کے تمام لوگوں کے لئے ہدایت، ذکر اور ڈرانے والا بیان کرتی ہیں، نہ صرف متقین کے لئے، خداوندمتعال ان آیات میں ارشاد فرماتا ہے: اس نے پہلے لوگوں کے لئے ہدایت بن کر اور حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب بھی نازل کی ہے، بیشک جو لوگ آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں ان کے واسطے شدید عذاب ہے اور خدا سخت انتقام لینے والا ہے۔[3]

ایک دوسری آیہ شریفہ میں عام ہدایت کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:۔۔ ماہ

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے، جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور حق و باطل کے امتیاز کی واضح نشانیاں موجود ہیں۔[4]

قرآن مجید کے ذکر ہونے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

یہ (قرآن) تمام دنیا والوں کے لئے ایک تذکر ہے۔[5] اور تمام لوگوں کے لئے قرآن کے نذیر (ڈرانے والا) ہونے کے بارے میں ارشاد ہے: با برکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا ہے تاکہ وہ سارے عالمین کے لئے عذاب الٰہی سے ڈرانے والا بن جائے گا۔[6]

پس اس قسم کی آیات سے مجموعی طور پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی کتابوں، خاص کر قرآن مجید کے ہدایت کنندہ ہونے کے بارے میں دو طرح ذکر کیا گیا ہے:

اول: تمام دنیا والوں کے لئے ہدایت اور بیداری، دوم: متقین کی ہدایت۔ یعنی قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو تمام لوگوں کے لئے ہدایت کرنے والی ہے اور جو بھی شخص کسی خودغرضی کے بغیر اس کی طرف رجوع کرے اس کی ہدایت ہوگی۔

اس مطلب کو بیان کرنے والی قرآن مجید کی ایسی آیات ہیں، جو اس آسمانی کتاب کو ہر اس فرد کے لئے راہ ہدایت جانتی ہے، جس نے راہ مستقیم پر گامزن ہونے کا ارادہ کیا ہو[7] اور یا یہ کہ قرآن مجید کی شان نزول یہ ہے کہ زندہ دل اور پاک فطرت والے انسان اس سے استفادہ کریں اور ظالموں کے لئے بھی اتمام حجت ہے۔[8]

اس کے علاوہ، قرآن مجید کی ہدایت عام لوگوں تک ہی محدود و مخصوص نہیں ہے اور ایسا نہیں ہے کہ متقین اور مومنین اس سے استفادہ نہ کرسکیں بلکہ قرآن مجید ان کے لئے ایک برتر ہادی ہے۔

ب۔ قرآن مجید میں متقین کے لئے دو قسم کی ہدایت:

جیسا کہ قرآن مجید کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ، کفار اور منافقین دو قسم کی ضلالت و گمراہی رکھتے ہیں، اس کے مقابلے میں متقین اور مومنین کے لئے بھی دو قسم کی ہدایت ہے۔قرآن مجید کی آیات میں منافقین کی جن دو قسم کی ضلالت و گمراہی کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ایک پہلی ضلالت[و اندھاپن] ہے، جو کفر و نفاق کی وجہ سے ان میں اوصاف خبیثہ کے عنوان سے پیدا ہوتی ہے، دوسری ضلالت [و اندھاپن،] ان کی پہلی ضلالت و اندھے پن کوتقویت بخشتی ہے،قرآن مجید میں منافقین کے بارے میں ارشاد ہے: ان کے دلوں میں بیماری ہے اور خدا نے نفاق کی بنا پر اسے اور بھی بڑھا دیا ہے۔[9] پہلی بیماری کومنافقین سےنسبت دیتا ہےاور دوسری بیماری کوخود سےنسبت دیتا ہے۔

ہدایت کے بارے میں بھی اسی طرح ہے کہ ایک ابتدائی ہدایت ہے کہ اس ہدایت سے پہلے قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے بلکہ اس قسم کی ہدایت کے لئےصرف ایک پاک فطرت کا ہونا کافی ہے،لیکن دوسری ہدایت قرآن مجید کی طرف سے پہلی ہدایت کے ذیل میں ہوتی ہےسورہ بقرہ کی دوسری آیت میں ارشادفرماتا ہے: یہ وہ کتاب ہےجس میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ صاحبان تقوی اور پرہیزگارلوگوں کے لئے مجسم ہدایت ہے۔[10] اس کے بعد متقین کی صفات کو گنتے ہوئے تقوی کی صرف پانچ صفتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ غیب پر ایمان رکھنا، نماز قائم کرنا، راہ خدا میں انفاق کرنا، انبیاء[ع] پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھنا اور سرانجام آخرت پر یقین رکھنا ہے۔

اس سلسلہ میں دور کی احتمالی مشکل کوحل کرنے کے بارے میں علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: انسان تب تک متقی[اور مذکورہ پانچ صفتوں کا مالک]نہیں بن سکتا ہے،مگر یہ کہ خداوندمتعال نے اس کی ہدائت کی ہو،اسوقت خداوندمتعال اپنی کتاب کو یوں معرفی فرماتا

ہے کہ:ان ہی متقین کی ہدائت کرنے والی ہے[لا ریب فیہ ہدی للمتقین]۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی ہدایت، اس ہدایت کے علاوہ ہےجس کے بارے مس مذکورہ اوصاف ذکر کئے گئے ہیں، اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ متقین کے لئے بھی دوقسم کی ہدایت ہے، ایک ابتدائی ہدایت،جس کی وجہ سے وہ متقی ہوئے ہیں اور ایک دوسری ہدایت، جو خداوند متعال نے انہیں ان کےتقوی اور پرہیزگاری کی وجہ سے عنایت کی ہے۔[11]

بہ الفاظ دیگر: ابتدائی ہدایت قرآن مجید سے پہلے تھی، یعنی اسی قدر کہ حق وحقیقت کے مقابلے میں انسان ہٹ دھرمی نہ کرے اومنصفانہ طور پر اپنی ناتوانی کا اظہار کرے، اس قسم کا شخص سرانجام ایک ایسے غایب موجود کے بارے میں ایمان رکھ سکتا ہے، جسے وہ اپنی حس سے پیدا کرسکتا ہے، ایک ایسا موجود جس کی بنا پر اس کی ہستی اور پوری کائنات کی ہستی قائم ہے۔ایک پاک فطرت انسان جب اس موجود غیب پر ایمان لاتا ہے، اعتراف کرتا ہے، تو سوچتا ہے کہ یہ مبداء، جومخلوقات کے حوائج سے ایک دقیقیہ کے لئے بھی غافل نہیں رہتا ہے، اور ہر مخلوق کی ایسی سرپرستی کرتا ہے کہ گویا اس کے علاوہ اس کی کوئی اور مخلوق نہیں ہے، کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے بندوں کی ہدایت سے غافل رہے اور مہلک اعمال و اخلاق کے بارے میں نجات کی راہ دکھانے میں ان کی راہنمائی نہ کرے؟

یہ جو انسان اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہے اور دوسرے سوالات جو اس سے پیدا ہوتے ہیں، اسی کا نتیجہ توحید، نبوت اور معاد ہوتا ہے اور اس طرح وہ خود پر لازم جانتا ہے کہ اس مبداء یکتا کے سامنے خضوع وخشوع کا مظاہرہ کرے، کیونکہ وہی اس کا خالق اور رب اور تمام کائنات کا خالق ورب ہے اور وہ اپنے آپ پر لازم جانتا ہے کہ اس کی ہدایت کو حاصل کرنے کی تلاش وکوشش کرے اور جب اس کی ہدایت کو حاصل کرتا ہے تو وہ اپنا سب کچھ یعنی مال، جاہ، علم اور فضیلت اس ہدایت کی حفاظت اور اس کی نشر واشاعت میں صرف کرتا

ہے اور یہ وہی اس کی نماز ہوتی ہے، لیکن یہ قرآن مجید کی نماز و زکوۃ نہیں ہوتی ہے، کیونکہ ہم پاک فطرت انسان کی بات کرتے ہیں، کہ ان چیزوں کو وہ اپنی فطرت میں پاتا ہے اور جب نماز و زکوۃ کی ذمہ داری اس پر ڈالی جاتی ہے، تو اسے بھی اپنی فطرت سے قبول کرتا ہے۔[12]

لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ پانچ صفتیں، جنہیں خداوند متعال نے اپنی قرآنی ہدایت کی بنیاد قرار دیا ہے، ایسی صفتیں ہیں جو انسان میں پاک فطرت پیدا کرتی ہیں اور زیر بحث آیات میں اس قسم کی صفتیں رکھنے والوں کو وعدہ دیا جاتا ہے کہ عنقریب انہیں قرآن مجید کے ذریعہ ہدایت کی جائے گی، لیکن یہ ہدایت، ان کی فطری ہدایت کے علاوہ ہے، پس مذکورہ پانچ اعمال، دو ہدایتوں کے درمیان ہیں، ان اعمال سے پہلی ہدایت اور ان اعمال سے ملحق ہدایت، اور سچے اعتقادات اور اعمال صالح ان دو ہدایتوں کے درمیان واسطہ ہیں، اس طرح کہ اگر فطری ہدایت کے بعد وہ اعتقاد و اعمال نہ ہوں تو دوسری ہدایت حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر اس طرح دور کی مشکل پیدا نہیں ہوتی ہے۔

حواشی:

[1] البتہ بعض دوسری ایات میں، انجیل کے مانند مقدس کتابوں کو بھی متقین کے لئے موعظہ و ہدایت شمار کیا گیا ہے۔ خداوند متعال سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۴۶ میں ارشاد فرماتا ہے: اور ہم نے انہیں انبیاء کے نقش قدم پر عیسیٰ بن مریم کو چلا دیا جو اپنے سامنے کی توریت کی تصدیق کرنے والے تھے اور ہم نے انہیں انجیل دیدی جس میں ہدایت اور نور تھا اور وہ اپنے سامنے کی توریت کی تصدیق کرنے والی اور ہدایت تھی اور صاحبان تقوی کے لئے سامان نصیحت تھی۔

[2] بقرہ،2؛ آل عمران، 138؛ نور، 34،نحل، 89؛نحل، 102؛ فصلت 44؛یونس 57.

[3] آل عمران،3 و4.

[4] بقرہ،185

[5] ص،87؛ قلم،52؛ تکویر،27.

[6] فرقان،1.

[7] تکویر،28-27؛ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۙ﴿۲۷﴾ لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَ ؕ﴿۲۸﴾

[8] یس،70؛ لِّيُنۡذِرَ مَنۡ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الۡقَوۡلُ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۷۰﴾

[9] بقرہ،10.

[10] بقرہ،2.

[11] طباطبایی، محمد حسین، ترجمہ تفسیر المیزان، ج 1، ص 70، دفتر انتشارات اسلامی، قم، 1374 ہ ش.

[12] ایضا، ج 1، ص 71.

خداوند متعال نے کیوں فرمایا ہے: ان مع العسر یسرا اور یہ نہیں فرمایا ہے کہ: ان بعد العسر یسرا؟

مختصر جواب

مذکورہ آیہ شریفہ میں سختیوں کو برداشت کرنے اور آسانی تک پہنچنے کے درمیان ایک قسم کی ہم آہنگی اور ارتباط پایا جاتا ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ انسان سختیوں کے بعد اتفاقی طور پر آسانی تک پہنچتا ہے، اس لحاظ سے عسر و یسر (زحمت اور آسانی) کے درمیان اس پیوند کے لئے ایک لفظ کی ضرورت ہے کہ جس کے یہ معنی ہوں اور وہ لفظ مع ہے۔

مع کو استعمال کرنے کے سلسلہ میں، مفسرین نے متعدد تفسیریں کی ہیں، من جملہ یہ کہ:

الف۔ آیہ شریفہ لفظ مع سے یہ سمجھاتی ہے کہ آسانی، رنج و زحمت کے ساتھ منسلک ہے، سختی برداشت کرنے کے لمحہ کے بعد رفتہ رفتہ آسانی حاصل ہوتی ہے۔

ب۔ لفظ مع سے استفادہ کیا گیا ہے تا کہ معلوم ہوجائے کہ آسانی، سختی کے قریب ہوتی ہے اور اس طرح دل کو سکون اور تسلی حاصل ہو جائے۔

بہرحال، اس کے پیش نظر کہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی آمیختہ ہے اور ہر سختی کے ساتھ سہولت بھی ہے، اور یہ دونوں ہمیشہ ایک ساتھ تھے اور ہوں گی، اگر یہاں پر لفظ بعد

استعمال کریں تو یہ وہ لطیف معنی نہیں دیتا ہے۔

تفصیلی جواب

خداوند متعال نے اس آیہ شریفہ میں اپنے پیغمبر(ص] سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے: پس (جان لو کہ) ہر تکلیف کے ساتھ سہولیت بھی ہے۔[1]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں بہت سی تکالیف اور مشکلات سے دوچار تھے، ظاہر ہے کہ یہ خداوند متعال کی طرف سے ایک وعدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مدینہ منورہ میں آسانی ہے یا یہ کہ دنیا میں پیش آنے والی سختیوں کے بعد بہشت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے سہولیت ہے۔

لیکن آیات کے مفہوم کی وسعت میں تمام مشکلات شامل ہوتی ہیں، یعنی یہ دو آیتیں ایسے پیش کی گئی ہیں کہ صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ ایک کلی قاعدہ کی صورت میں پیش کی گئی ہیں، اور تمام مومن، مخلص اور کوشش کرنے والے انسانوں کے لئے بشارت ہے کہ ہمیشہ سختیوں کے ساتھ سہولتیں ہیں۔[2]

لفظ مع کے استعمال کے سلسلہ میں کئی تفسیریں کی گئی ہیں کہ ان میں سے اکثر قابل جمع ہیں اور ہم ذیل میں ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الف۔ لفظ بعد کی جگہ پر لفظ مع کا استعمال اس لئے ہے کہ اس سے عسر (سختی) اور یسر (آسانی) کے درمیان پیوستگی معلوم ہوتی ہے،[3] یعنی آیہ شریفہ میں سختیوں اور سہولتوں کے درمیان ایک قسم کی پیوستگی اور رابطہ پایا جاتا ہے، یعنی اس طرح نہیں ہے کہ انسان سختیوں کے بعد اتفاقی طور پر آسانی تک پہنچتا ہے، اس لحاظ سے، سختی اور آسانی کے درمیان اس پیوند کے لئے ایک لفظ کی ضرورت ہے، جس میں یہ معنی پائے جاتے ہوں اور وہ لفظ مع ہے۔

بہ الفاظ دیگر، آیہ شریفہ لفظ مع کے ذریعہ سمجھاتی ہے کہ آسانی اور رنج وتکلیف میں چولی دامن کا ساتھ ہے، سختیاں برداشت کرنے کے لمحہ سے، رفتہ رفتہ آسانی ہاتھ آتی ہے۔[4] بہرحال لفظ مع ہمراہی کی علامت ہے،[5] اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو عسر و یسر نا قابل جدائی ہیں۔

ب۔ اس لئے لفظ مع سے استفادہ کیا گیا ہے۔ تاکہ معلوم ہوجائے آسانی، سختی کے قریب ہے اور اس طرح دل کو اطمینان اور تسلی حاصل ہوجائے۔[6]

قابل ذکر ہے کہ علامہ طبا طبائی اس کے قائل ہیں کہ لفظ مع = سے مراد عسر (سختی) کے ضمن میں یسر (آسانی) ہوتی ہے، نہ یہ کہ اس مع سے یہ مراد ہو کہ عسر اور یسر ایک ہی زمانہ میں واقع ہوتے ہیں۔[7]

بہرحال مع کے معنی جو بھی ہوں، چونکہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی آمیختہ ہے اور ہر تکلیف کے ساتھ ایک سہولت ہے، اور یہ دو چیزیں ہمیشہ ایک ساتھ تھیں اور ہوں گی[8]

اس لئے یہاں پر لفظ مع سے استفادہ کرنا بے معنی نہیں ہے۔

حواشی

[1] انشراح، 5 و 6.

[2] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج 27، ص 127، دار الکتب ال اِسلامیۃ، طبع تہران، طبع اول، 1374 ہ ش.

[3] طالقانی، سید محمود، پرتوی از قرآن، ج 4، ص 157، شرکت سہامی انتشار، تہران، 1362 ہ ش.

[4] قرشی، سید علی اکبر، تفسیر اُحسن الحدیث، ج 12، ص 274، بنیاد بعثت، تہران، 1377 ہ ش.

[5] تفسیر نمونہ، ج 27، ص 127 و 8۱۲.

[6] طبرسی، فضل بن حسن، تفسیر جوامع الجامع، ج 4، ص 507، انتشارات دانشگاہ تہران و مدیریت حوزہ علمیہ قم، تہران، طبع اول، 1377 ش؛ ابن جزی غرناطی، محمد بن احمد، کتاب التسہیل لعلوم التنزیل، ج 2،

ص 493، شرکت دار الارقم بن ابی الارقم، طبع اول، 1416۔

[7] طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیزان، موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ج20، ص 534، دفتر انتشارات اسلامی، قم، طبع پنجم، 1374 ہ ش.

[8] نمونہ، ج27، ص127 و128.

قرآن مجید کے سورہ نحل کی آیت نمبر ۴۸ میں کیوں شمائل کو جمع لایا گیا ہے جبکہ یمین کو مفرد لایا گیا ہے؟

سورہ نحل کی آیت نمبر ۴۸ میں آیا ہے:: اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَیۡءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمۡ دٰخِرُوۡنَ﴿۴۸﴾ میں نے تفسیر المیزان، تفسیر نمونہ اور تفسیر فیض الاسلام میں یہ جاننے کی کوشش کی کہ مذکورہ آیہ شریفہ میں کیوں شمائل جمع کی صورت میں آیا ہے جبکہ یمین مفرد آیا ہے، لیکن مجھے ان تفاسیر کی وضاحتیں مبہم لگیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر ممکن ہو تو مہربانی کر کے سادہ اور عام فہم الفاظ میں وضاحت کیجئے کہ اس آیہ شریفہ میں یمین و شمال سے مراد کیا ہے اور شمائل کیوں جمع کی صورت میں آیا ہے؟

مختصر جواب

اس آیہ شریفہ میں خداوند متعال اجسام کے سایوں کو اپنی عظمت کی نشانیوں کے عنوان سے تعارف کراتا ہے اور انہیں اپنے پروردگار کے لئے سجدہ کی حالت میں جانتا ہے۔
اجسام کے سائے ہماری زندگی میں ایک موثر رول رکھتے ہیں، جیسے: سورج کی روشنی، کرنوں اور حرارت کی تعدیل اجسام کو دیکھنے میں مدد وغیرہ۔
مفسرین نے لفظ شمائل کو جمع استعمال کرنے اور یمین کو مفرد استعمال کرنے کے

سلسلہ میں متعدد وجوہات بیان کئے ہیں کہ ہم تفصیلی جواب میں ان کی طرف اشارہ کریں گے۔

تفصیلی جواب

اس آیہ شریفہ میں خداوند متعال، اجسام کے سایوں کی دائیں بائیں کی طرف حرکت کو اپنی عظمت کی نشانیوں کے عنوان سے بیان کرتا ہے اور انہیں اپنے پروردگار کے لئے سجدہ، تواضع اور خضوع وخشوع کی حالت میں جانتا ہے۔

بیشک، اجسام کے سائے ہماری زندگی میں موثر رول ادا کرتے ہیں، ممکن ہے بہت سے لوگ اس سے غافل ہوں، اورقرآن مجید کا سایوں کے اس مسئلہ کو اہمیت دینا اسی نکتہ کی طرف توجہ دلانا ہے۔[1]

سائے اگر چہ عدم نور کے علاوہ کچھ نہیں ہیں، لیکن ان کے بہت سے فائدے ہیں جیسے:

۱۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کی روشنی اوراس کی حیات بخش شعائیں مخلوقات کی زندگی اور ان کے نشو ونما کا سر چشمہ ہیں، سائے بھی نور کی کرنوں کی تعدیل میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ سورج کی یکساں تپش اگر ایک طولانی مدت تک جاری رہے، تو تمام چیزوں کو پژمردہ کر دیتی ہے اور انہیں جلا کر راکھ کر دیتی ہے، لیکن یہ سائے ہی ہیں جو سورج کی اس تپش کو معتدل اور موثر حد میں کنٹرول کرتے ہیں۔

۲۔ عام تصور کے برعکس صرف نور ہی اشیاء کو دیکھنے کا سبب نہیں ہے، بلکہ نور کو ہمیشہ سایوں اور نیم سایوں کے ہمراہ ہونا چاہئے، تا کہ اشیاء کا مشاہدہ متحقق ہو جائے، بہ الفاظ دیگر اگر کسی چیز کے اطراف میں نور یکساں صورت میں پڑتا رہے، اس طرح کہ کسی قسم کا سایہ یا نیم سایہ موجود نہ ہو، تو اس قسم کی چیزیں جو نور میں غرق ہوتی ہیں ہرگز دکھائی نہیں دیں گی۔

یعنی، جس طرح مطلق تاریکی میں کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی ہے، اسی طرح مطلق نور میں بھی کوئی چیز قابل رویت نہیں ہوتی ہے، بلکہ اشیاء کو دیکھنا، نور اور ظلمت (روشنی اور سایہ) کی آمیختگی سے ہی ممکن ہے، اس لحاظ سے، اشیاء کے مشاہدہ اور ان کی ایک دوسرے سے تشخیص میں سایوں کا کلیدی اور موثر رول ہوتا ہے۔ (غور فرمائیے)

لیکن یہ کہ اس آیہ شریف میں کیوں یمین (دایاں) مفرد کی صورت میں اور شمائل (شمال یعنی بایاں) جمع کی صورت میں آیا ہے۔ مفسرین نے اس کے کچھ وجوہات بیان کئے ہیں۔ ہم ذیل میں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

ا۔ اس تعبیر میں فرق شاید اس لئے ہو کہ سایہ، صبح کی ابتدا میں (جنوب کے نقطہ پر توجہ کرنے والوں کے لئے) دائیں طرف پڑتا ہے اور اس کے بعد مسلسل بائیں طرف حرکت کرتا ہے تا کہ غروب کے وقت مشرق کے افق پر محو ہوجائے، [2] پس بائیں جانب سایوں کی کثرت معنی رکھتی ہے۔

۲۔ یمین اگرچہ مفرد ہے لیکن بعض اوقات اس سے جمع کا ارادہ کیا جاتا ہے اور یہاں پر مراد جمع ہے۔ [3]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ: یہ جو خداوند متعال لفظ یمین کو مفرد صورت میں لایا ہے (اگرچہ اس سے مراد جمع ہے) لفظ کو خلاصہ اور مختصر کرنے کے لئے ہے اور یمین اس لفظ شئی کی طرف پلٹتا ہے جو جمع ہے، کیونکہ لفظ شئی سے جمع ارادہ کیا گیا ہے۔ [4]

۳۔ یمین کو مفرد لانا اور شمائل کو جمع لانا اس معنی کی طرف اشارہ ہے کہ یمین (دایاں) ایک کے معنی میں ہے، جبکہ شمال کی جہت زیادہ ہے، کیونکہ ہر چیز کا معنوی یمین اس کی وہی الٰہی جہت ہے، اور ہر چیز کا شمال اس کی خلقت کی جہت ہے اور وجہ الٰہی کی کثرت وحدت میں پائی جاتی ہے اور اس کی خلقت کی وجہ الٰہی کی وحدت، کثرت میں فانی ہوتی ہے [5]

حواشی:

[1] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج11، ص: 254 (با اندکی تصرف)، نشر دار الکتب ال اِسلامیۃ، تہران، 1374 ہ۔ش

[2] تفسیر قرطبی ذیل آیہ فوق.

[3] رازی، ابو الفتوح روض الجنان و روح الجنان فی تفسیر القرآن (تفسیر ابو الفتوح رازی)، ج12، ص: 45، نشر بنیاد پژوہشہای اسلامی آستان قدس رضوی، مشہد، 1408 ہ۔

[4] بغدادی علاء الدین علی بن محمد، لباب التأویل فی معانی التنزیل، ج3، ص: 80، نشر دار الکتب العلمیۃ، بیروت،، 1415 ہ ش

[5] خانی رضا۔ ریاضی، حشمت اللہ ترجمہ بیان السعادۃ، ج8، ص130 ، نشر مرکز چاپ و انتشارات دانشگاہ پیامنور، تہران، 1372 ہ۔ش

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۵۴ کے مطابق اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیرو قیامت تک کفار پر برتری رکھتے ہیں، تو کیا ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو قبول کرنا چاہئے تا کہ قیامت تک تمام کفار سے برتر رہیں؟

خداوند متعال قرآن مجید کے سورہ آل عمران کی ایت نمبر ۵۴ میں ارشاد فرماتا ہے: میں نے قیامت تک تمہارے [عیسیٰ کے] پیرووں کو کفار پر برتری دی ہے۔ اگر حضرت عیسیٰؑ کے پیرو قیامت تک تمام کفار پر برتر ہیں، تو کیوں ہم نے دین محمد (ص) کو اختیار کیا ہے؟ ہم حضرت عیسیٰؑ کے دین کو اختیار کرتے تا کہ قیامت تک تمام کفار پر برتر رہتے؟

مختصر جواب

مذکورہ سوال کے بارے میں مختلف جوابات اور نظریات پیش کئے گئے ہیں کہ ہم ان میں سے ذیل میں بعض کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

ا۔حضرت عیسیٰؑ کے پیرووں سے مراد، امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اور اس مطلب کے لئے تین وجوہات بیان کی گئی ہیں:

الف۔ کیونکہ زمانہ کے لحاظ سے امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عیسیٰؑ کے بعد ہے۔

ب۔ چونکہ ہمارے پیغمبر نے حضرت عیسی [ع] اور ان کی کتاب کی تصدیق کی ہے اور جو دوسرے کی تصدیق کرے کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کی متابعت کی ہے۔

ج۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت، توحید کے باب میں دوسرے انبیاء کے ساتھ متحد ہے کیونکہ یہ دین کی بنیاد ہے، اس بنا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے انبیاء کے متبع ہیں۔

۲۔ آیہ شریفہ میں اتباع سے مراد حق کی پیروی ہے، پیرو وہ ہیں جنہیں خداوند متعال کی رضامندی حاصل ہے، پس جو تیری پیروی کرتے ہیں کی عبارت، ظہور اسلام سے پہلے تک عیسائیوں اور ظہور اسلام کے بعد اسلام پر استقامت کرنے والے افراد پر مشتمل ہے۔

۳۔ زیر بحث آیہ شریفہ سے مراد یہ ہے کہ خداوند متعال عیسائیوں کو یہودیوں پر برتری عطا کرے گا (یہ تفسیر ظاہر آیت کے زیادہ مطابق ہے)

۴۔ اس (مجموعا) سے مراد عیسائی اور مسلمان ہے اور آیہ شریفہ یہ خبر دینا چاہتی ہے کہ یہود، قیامت تک ذلیل وخوار اور حضرت عیسیٰؑ کی پیروی کو واجب جاننے والوں کے دباو میں رہیں گے۔

لیکن یہ کہ مسلمان کیوں حضرت عیسیٰؑ کی نسبت سے کفار میں شمار نہیں ہوتے ہیں وہ اس لئے ہے کہ یہاں پر کافر منکر کے معنی میں ہے اور یہ یہودی قوم ہے کہ جس نے حضرت عیسیٰؑ کا انکار کیا، لیکن مسلمان نہ صرف حضرت عیسیٰؑ کا انکار نہیں کرتے ہیں اور ان کی نسبت سے کافر نہیں ہیں بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے توسط سے پیغمبر اسلام کی بعثت کی بشارت دینے کے حقیقی پیرو ہیں۔

مسلمان، حضرت عیسیٰؑ کو بڑے پیغمبروں میں سے، تیسرے اولوالعزم پیغمبر، صاحب

شریعت اور صاحب کتاب پیغمبر جانتے ہیں، اس بنا پر خداوند متعال جو فرماتا ہے کہ ہم تمہاری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک کفار پر برتری دیں گے، بیشک یہاں پر کفار سے مراد مسلمان نہیں ہو سکتے ہیں کیونکہ اس لفظ کا کسی صورت میں مسلمانوں پر اطلاق نہیں ہوتا ہے۔

تفصیلی جواب

آپ کے سوال میں جو ترجمہ پیش کیا گیا ہے وہ اس آیہ شریفہ کے مطابق نہیں ہے ہم اس کا دقیق جواب دینے کے لئے پہلے اس آیہ شریفہ کا ترجمہ پیش کرتے ہیں اور اس کے بعد مورد سوال آیت کی تفسیر سے استفادہ کر کے اس کا جواب دیں گے۔

آیت کا ترجمہ:

اور ہم تمہاری (عیسیٰ کی) پیروی کرنے والوں کو انکار کرنے والوں (کفار) پر قیامت تک کی برتری دینے والے ہیں، اس کے بعد تم سب کی بازگشت ہماری طرف ہوگی اور ہم تمہارے اختلافات کا صحیح فیصلہ کر دیں گے۔[1]

واضح اور دقیق جواب تک پہنچنے کے لئے چند مسائل کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ اس لئے ہم مندرجہ ذیل مباحث اور آیہ شریفہ کے ضمن میں مطلوبہ جواب تک پہنچ جائیں گے۔

سوال میں ذکر کی گئی آیہ شریفہ کے بارے میں، مختلف جوابات اور نظریات پیش کئے گئے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض کی طرف ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

ا۔حضرت عیسیٰؑ کے پیرووں سے مراد، امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اور اس مطلب کے لئے تین وجوہات بیان کی گئی ہیں:

الف۔ کیونکہ زمانہ کے لحاظ سے امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عیسیٰؑ کے بعد ہے۔

ب۔ چونکہ ہمارے پیغمبر نے حضرت عیسی [ع] اور ان کی کتاب کی تصدیق کی ہے

اور جو دوسرے کی تصدیق کرے کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کی متابعت کی ہے۔

ج۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت، توحید کے باب میں دوسرے انبیاء کے ساتھ متحد ہے کیونکہ یہ دین کی بنیاد ہے، اس بنا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے انبیاء کے متبع ہیں۔[2]

۲۔آیہ شریفہ میں اتباع سے مراد حق کی پیروی ہے، پیرو وہ ہیں جنہیں خداوند متعال کی رضامندی حاصل ہے، پس جو تیری پیروی کرتے ہیں کی عبارت ظہور اسلام سے پہلے اور دین عیسیٰؑ کے منسوخ ہونے تک عیسائیت پر استوار افراد اور اس کے علاوہ ان مسلمانوں پر مشتمل ہے جنہوں نے ظہور اسلام کے بعد اسلام کی پیروی میں استقامت کا مظاہرہ کیا ہے اور اس کے پابند رہے ہیں، چونکہ اسلام کی پیروی، حق کی پیروی ہے اور درنتیجہ حضرت مسیحؑ کی پیروی ہے۔[3]

اس نظریہ کو علامہ طبا طبائی نے بعض مفسرین سے نسبت دے کر اس کی تنقید کی ہے۔[4]

۳۔زیر بحث آیہ شریفہ سے مراد یہ ہے کہ خداوند متعال عیسائیوں [5] کو یہودیوں (یعنی جن کے اجداد حضرت عیسیٰ کی نسبت سے کافر ہوئے اور ان کے خلاف سازش کی) پر برتری عطا کرے گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قوم یہود پر عذاب الٰہی نازل ہوگا اور عذاب الٰہی ان پر شدت اختیار کرے گا۔[6]

اسی تفسیر کی بنا پر، جو ظاہر آیت کے بھی مطابق ہے، یہ آیت ان معجزہ نما آیات میں سے ہے، جن میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے پیرو ہمیشہ یہودیوں سے برتر ہوں گے۔

ہم آج کی دنیا میں اس حقیقت کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ یہود وصہیونیت، عیسائیوں سے وابستگی اور ان کی مدد کے بغیر اپنی سیاسی و اجتماعی زندگی کو ایک دن بھی جاری نہیں رکھ سکتے

ہیں۔[7]

اس نظریہ کے مطابق، حضرت عیسیٰؑ کے پیرووں سے مراد عیسائی ہیں، اس لحاظ سے ہم ہر جگہ اور ہر وقت یہودیوں کو عیسائیوں سے ذلیل تر دیکھتے ہیں اور اسی وجہ سے یہودیوں سے ملک وسلطنت چھین لی گئی ہے اور یہ عیسائیوں کے قبضہ میں ہے (یوروپ اور روم وغیرہ میں) اور عیسائی، یہودیوں سے عزیز تر ہیں اور قیامت تک ان پر برتر رہیں گے۔[8]

۴۔جملہ الذین اتبعوا (مجموعا سب) سے مراد عیسائی اور مسلمان ہیں اور آیہ شریفہ خبر دینا چاہتی ہے کہ یہود قیامت تک ذلیل وخوار اور حضرت عیسیٰؑ کی پیروی کو واجب جاننے والوں کے زیر تسلط رہیں گے۔[9]

کیا مسلمان، حضرت عیسیٰؑ کی نسبت سے کافر ہیں؟ یہاں پر کافر سے مراد منکر ہے[10]، مسلمان نہ صرف حضرت عیسیٰؑ کو جھٹلاتے نہیں ہیں اور ان کی نسبت سے کافر نہیں ہیں بلکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو عظیم پیغمبروں میں سے ایک، تیسرے اولوالعزم پیغمبر اور صاحب شریعت وصاحب کتاب پیغمبر جانتے ہیں۔قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: بچہ نے آواز دی کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔[11] لیکن یہ یہودی تھے جنہوں نے حضرت عیسیٰ (ع] کا انکار کیا اور انہیں قتل تک پہنچایا۔

اس بنا پر خداوند متعال جو یہ فرماتا ہے کہ میں نے قیامت تک تمہارے (عیسیٰ کے) پیرووں کو کفار پر برتری عطا کی ہے، بیشک کفار سے مراد مسلمان نہیں ہوسکتے ہیں اور اس لفظ کا کسی صورت میں مسلمانوں پر اطلاق نہیں ہوتا ہے۔

اس بنا پر، جملہ الذین اتبعوا کے پیش نظر، اس میں حضرت عیسیٰؑ کے مجموعی پیروان شامل ہیں اور الذین اتبعوا کی عبارت کی تفسیر کے مطابق مسلمان بھی حضرت عیسیٰؑ کے پیرو شمار ہوتے ہیں، پس اس عبارت میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہیں اور اس طرح اس

آیہ شریفہ کے معنی یوں ہوتے ہیں: اور ہم تمہاری (عیسیٰ کی) پیروی کرنے والوں کا انکار کرنے والوں (کفار) پر قیامت تک برتری دینے والے ہیں، اس کے بعد تم سب کی باز گشت ہماری طرف ہوگی اور ہم تمہارے اختلافات کا صحیح فیصلہ کردیں گے۔

آخر پر، اس نکتہ کو بیان کرنا ضروری ہے کہ اگر ہم اس امر پر شک وشبہ سے دو چار ہوں کہ راہ حق پر چل کر ظاہرا شکست سے دو چار ہو جائیں یا یہ کہ باطل راہ پر چل کر بظاہر کامیاب ہو جائیں، تو پہلا انتخاب مناسب تر انتخاب ہوگا، چانچہ امام حسینؑ نے بھی اسی چیز کا انتخاب کیا ہے۔ اس بنا پر اگر اسلام کی حقانیت ہمارے لئے مشخص ہوئی اور ہم صرف ظاہری کامیابی کے لئے، مسحیت کی طرف (آپ کے سوال کے استدلال کے مطابق) میلان پیدا کریں تو یہ فیصلہ منطقی نہیں ہوگا اور قرآن مجید کی دوسری آیات من جملہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۰ کے مطابق نہیں ہوگا۔

اس موضوع کے بارے میں مزید آگاہی حاصل کرنے کے سلسلہ میں آپ ہماری اسی سائٹ کے عنوان سرخاتمیت دین اسلام سوال: ۳۵۰۳ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

حواشی

[1] ترجمہ ذیشان حیدر جوادی

[2] طبرسی، فضل بن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، مترجمان، ج 4، ص 94، ناشر: انتشارات فراہانی، تہران، طبع اول، 1360 ھ ش.

[3] طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیز ان، موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ج 3، ص 326 و ج 3، ص 327، ناشر: دفتر انتشارات اسلامی جامعۃ مدرسین حوزہ علمیہ قم، قم، طبع: پنجم، 1374 ھ ش.

[4] طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیز ان، موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ج 3، ص 328 و 329.

[5] طبرسی، فضل بن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، مترجمان، ج 4، ص 94.

[6] طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیز ان، موسوی ہمدانی، سید محمد باقر،، ج 3، ص 330.

[7]، مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج 2، ص 570، ناشر: دار الکتب ال اِسلامیۃ، طبع تہران، طبع طبرسی، فضل بن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، متر جمان، ج 4، ص 94. اول، 1374 ش.

[8] طبرسی، فضل بن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، متر جمان، ج 4، ص 94.

[9] طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیز ان، موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ج 3، ص 330.

[10] فراہیدی خلیل بن احمد، کتاب العین، ج 5، ص 356، طبع دوم، انتشارات ہجرت، قم، 1410 ہ.

[11] مریم، 30.

کیا قرآن مجید میں عورتوں پر مردوں کی برتری جتلانا عورتوں کی بے احترامی اور مردوں کے لئے فخر ومباہات کا سبب نہیں ہوتا ہے؟

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۷ میں ارشاد الٰہی ہے کہ: اور عورتوں کے لئے ویسے ہی حقوق بھی ہیں جیسی ذمہ داریاں ہیں اور مردوں کو ان پر ایک امتیاز حاصل ہے۔ کیا یہ آیہ شریفہ عورتوں کی توہین اور مردوں کے فخر ومباہات کا وسیلہ نہیں بن سکتی ہے؟

مختصر جواب

مردوں کی عورتوں پر برتری کا مسئلہ قرآن مجید کی بعض آیات میں آیا ہے۔ اس موضوع کو پیش کرنا اس معنی میں نہیں ہے کہ مرد ہر لحاظ سے عورتوں پر برتری رکھتے ہیں۔ بہت سے علماء اور مفسرین کے مطابق عورتوں پر مردوں کی برتری کی وجہ، وہ خصوصیات ہیں جن سے مرد استفادہ کرتے ہیں تا کہ ان کی بنا پر خاندان کے نظم ونسق کو چلانے کی ذمہ داری نبھا سکیں، حقیقت میں یہ برتری ایک فریضہ ہے کہ مردوں پر ذمہ داری ہے جسے انہیں عدل و انصاف کے ساتھ انجام دینا ہے، یہ ہر لحاظ سے ان کے لئے امتیاز نہیں ہے کہ جس پر وہ فخر و مباہات کریں اور عورتوں کے حقوق پامال کریں۔

تفصیلی جواب

انسانوں کی ایک دوسرے کی بہ نسبت فضیلت اور برتری کا موضوع مختلف صورتوں اور مناسبتوں سے قرآن مجید کی بعض آیات میں بیان کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل آیات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے:

۱۔ تمام مخلوقات پر انسان کی برتری: ارشاد الٰہی ہے کہ: اور ہم نے بنی آدم کو کرامت عطا کی ہے اور انہیں خشکی اور دریاوں میں سواریوں پر اٹھایا ہے اور انہیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سوں پر فضیلت دی ہے۔[1]

۲۔ بعض انسانوں کی ایک دوسرے پر برتری: ارشاد ہوتا ہے: اور اللہ ہی نے بعض کو رزق میں بعض پر فضیلت دی ہے۔[2]

۳۔ ایک قوم کی دوسری قوم پر برتری: اے بنی اسرائیل ہماری نعمتوں کو یاد کرو جو ہم نے تم پر نازل کی ہیں اور ہمارے عہد کو پورا کرو ہم نے تم کو لوگوں پر برتری عطا کی ہے۔[3]

۴۔ پیغمبروں کی ایک دوسرے پر برتری: یہ سب رسول وہ ہیں جنہیں ہم نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے خدا نے کلام کیا ہے اور بعض کے درجات بلند کئے ہیں اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی ہوئی نشانیاں دی ہیں اور روح القدس کے ذریعہ ان کی تائید کی ہے۔[4]

۵۔ مرد کی عورت پر برتری: مرد، عورتوں کے حاکم اور نگراں ہیں اور فضیلتوں کی بنا پر جو خدا نے بعض کو بعض پر دی ہیں اور اس بنا پر کہ انہوں نے عورتوں پر اپنا مال خرچ کیا ہے۔[5]

۶۔ مومنوں کی ایک دوسرے پر برتری: اور ہر ایک کے لئے اس کے اعمال کے

مطابق درجات ہیں اور تمہارا پروردگار ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔[6]

مذکورہ مطالب کے پیش نظر، اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے کہ خداوند متعال نے اپنے حکیمانہ ارادہ کے مطابق بعض افراد کو خصوصیات میں دوسروں پر برتری عطا کی ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم جان لیں کہ جو برتریاں خداوند متعال نے بعض افراد کو عطا کی ہیں وہ کبھی مادی پہلو رکھتی ہیں، جیسے انسانوں کی رزق کے سلسلہ میں دوسری تمام مخلوقات پر برتری، اور کبھی اس برتری کا پہلو معنوی ہوتا ہے، جیسے: انسانوں کے لئے انبیاءؑ کی ہدایت کی برتری، کبھی ان درجات اور فضیلتوں سے مراد دنیا میں برتری ہوتا ہے اور کبھی یہ فضیلت آخرت میں ہوتی ہے۔

البتہ مردوں کی عورتوں پر برتری، جو قرآن مجید کی بعض آیات میں بیان کی گئی ہے، علماء اور دانشوروں کے لئے مختلف نظریات پیش کرنے کا سبب بنی ہے۔ بعض مفسرین ظاہری معنی سے استفادہ کرکے مردوں کو تمام جہات سے برتری بخشنے کی کوشش کرتے ہیں۔[7] اسی طرح بعض افراد جو مغربی طرز تفکر کے اثر میں قرار پائے ہیں اور حقوق انسان کے زاویہ سے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہیں، انہوں نے کوشش کی ہے کہ مردوں کی برتری کو مغربی معاشرہ میں رائج قوانین کے مطابق پیش کریں۔ اس سلسلہ میں ایک تیسرا نظریہ ہے جس میں مرد سالاری اور زن محوری سے بالاتر اس موضوع پر بحث کی گئی ہے۔

مردوں کی برتری کے بارے میں جن آیات میں ذکر کیا گیا ہے، ان میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۷ ہے۔ اس آیہ شریفہ میں لفظ درجہ سے استفادہ کیا گیا ہے، جو برتری بیان کرتا ہے۔

مفسرین نے اس آیہ شریفہ کی تفسیر اور لفظ درجہ سے مراد کے بارے میں کئی نظریات پیش کئے ہیں۔ ان نظریات میں سے مندرجہ ذیل دو اہم نظریات کے بارے میں

اشارہ کیا جاسکتا ہے:

بعض افراد نے لفظ درجہ سے طلاق اور رجوع میں مرد کے حق کی تعبیر کی ہے۔[8]

اس کے علاوہ بعض نے کہا ہے کہ آیہ شریفہ میں درجہ سے مراد مردوں کی سرپرستی اور نظامت کا حق ہے کہ سورہ نساء کی آیت نمبر ۳۴ میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[9]

اس بنا پر، اس آیہ شریفہ اور اس کے مانند دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو عورتوں کی بہ نسبت بیشتر امتیاز حاصل ہے۔ لہٰذا بعض افراد کے لئے یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ یہ برتری کیسے عدالت کے موافق ہے؟

عورتوں اور مردوں کے جسمانی اور روحانی قوا میں پائے جانے والے وسیع اختلافات کے پیش نظر، اس سوال کا جواب واضح ہے۔ عورت ذات مردوں کے فرائض کی بہ نسبت متفاوت فرائض کی انجام دہی کے لئے پیدا کی گئی ہے اور اسی وجہ سے، اس میں متفاوت جذبات پائے جاتے ہیں۔ خلقت کے قانون نے مامتا اور انسانی نسل کی پرورش کے حساس فرائض اس کے ذمہ رکھے ہیں اسی لئے اسے بیشتر جذبات اور احساسات عطا کئے گئے ہیں، جبکہ اس قانون کے مطابق مرد پر سخت اور سنگین تر اجتماعی فرائض عائد کئے گئے ہیں، اس بنا پر اگر ہم عدل و انصاف کی رعایت کرنا چاہیں، تو اجتماعی فرائض کا ایک حصہ، جس کے لئے زیادہ مقاومت و برداشت کی ضرورت ہے، مردوں پر ڈالا جانا چاہئے اور جن فرائض کے لئے زیادہ جذبات و احساسات کی ضرورت ہے، انہیں عورتوں پر ڈالا جانا چاہئے اور اسی وجہ سے گھر کی نظامت مرد کے ذمہ اور اس کا تعاون عورت کے ذمہ رکھا گیا ہے۔ بہر حال یہ فرائض اس امر میں رکاوٹ نہیں بن سکتے ہیں کہ عورت معاشرہ کی ان ذمہ داریوں کو نبھائے جو اس کے جسم و جان کی بناوٹ کے مطابق اور سازگار ہوں، اور مامتا کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ، دوسرے حساس اور مناسب فرائض کو بھی انجام دے۔ اس کے علاوہ یہ

تفاوت، اس امر میں بھی رکاوٹ نہیں بن سکتا ہے کہ معنوی مقامات،علم وتقوی کے لحاظ سے بعض عورتیں مردوں سے برتر ہوں۔

حکمت اور تدبیر الٰہی کا تقاضا ہے کہ جو شخص بھی معاشرہ میں کوئی ذمہ داری سنبھالے وہ اس کے جسم و جاں کی بناوٹ سے ہم آہنگ ہونی چاہئے، اور خداوند متعال کی حکمت کا تقاضا ہے کہ جو فرائض عورتوں پر ڈالے گئے ہیں، انہیں مسلم حقوق جاننا چاہئے تا کہ فریضہ اور حق کے درمیان توازن برقرار رہے۔[10]

اسی طرح جاننا چاہئے کہ کیفیت کے لحاظ سے برتری ایک الٰہی نعمت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کا بعض دوسرے لوگوں پر تسلط، بذات خود انسانی معاشرہ کی مصلحتوں میں شمار ہوتا ہے، کیونکہ تسلط جمانے والا طبقہ اپنی طاقت کی وجہ سے، اپنے ماتحت طبقہ کے مسائل کو تدبیر سے حل کرتا ہے۔[11]

اس کے پیش نظر کہ مرد اور عورت میں سے ایک شخص کو گھر کا نظم ونسق چلانا، چاہئے: اگر ہم یہ تصور کریں کہ یہ برتری مرد کے بجائے عورت سے مخصوص ہوتی،تو پھر بھی یہ سوال باقی تھا، لہٰذا مرد اور عورت کے درمیان بعض خصوصیات میں تفاوت اور مرد کی برتری، خداوند متعال کے حکیمانہ امور میں سے ہے اور خاندان کے امور کی مصلحت کا لازمہ بھی ہے، البتہ مرد اور عورت میں سے ہر ایک اپنی خصوصیت کی بنا پر خاندان کے نظام میں مشخص کارکردگی رکھتے ہیں اور ان کے حقوق معین اور مشخص ہیں۔

مردوں اور عورتوں کے حقوق اور فرائض کے موضوع کے بارے میں مزید آگاہی حاصل کرنے کے لئے ہماری اسی سائٹ کے عنوان: وظائف زنان در برابر مردان سوال: ۸۵۰ (سائٹ: ۹۲۵) کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

لیکن یہ مسئلہ کہ مردوں کو خدا کی طرف سے برتری عطا کرنا،ممکن ہے مردوں کے

لئے فخر و مباہات، کا ناجائز فائدہ اٹھانے اور بالآخر عورتوں کے حقوق سے چشم پوشی کرنے کا سبب بن جائے، اس کے بارے میں کہنا ہے کہ خداوند متعال نے انسانوں کے حق میں اپنی نعمتیں عطا کرنے کے سلسلہ میں، ان نعمتوں کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے امکان کے پیش نظر عمومی صورت میں تمام انسانوں کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کیا ہے،[12] البتہ قابل بیان ہے کہ انسان کے اعمال الٰہی نعمتوں کے جاری رہنے، اضافہ ہونے یا محروم ہونے میں بے اثر نہیں ہیں۔[13]

اسی طرح مذکورہ جہات سے مردوں کی برتری ان کی اخروی برتری کا سبب نہیں بنتی ہے، یعنی انسانوں کو ایک دوسرے کی بہ نسبت زیادہ مال ملنا، زیادہ تنخواہ ملنا اور جسمانی طاقت کا زیادہ ہونا، بارگاہ الٰہی میں ان کے لئے بلند مقام حاصل کرنے کا سبب نہیں بن سکتا ہے، قرآن مجید کے مطابق جو کچھ حقیقی برتری کا سبب بنتا ہے، وہ تقوی اور عمل صالح ہے۔[14] یہی وجہ ہے کہ خداوند متعال انسانوں کو ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ لین دین کے سلسلہ میں تکبر، خودخواہی اور دوسروں کی بے احترامی کرنے کو منع کرتا ہے۔[15]

دوسری بات یہ کہ خداوند متعال نے مردوں کو عورتوں پر برتری دے کر اور اس خصوصیت کے مطابق انہیں مسئولیت دے کر آزاد نہیں چھوڑا ہے، بلکہ مکرر طور پر مردوں کو اس امر کی فہمائش کی ہے کہ ازدواجی زندگی کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے عورتوں کے ساتھ کیسا برتاو کریں تا کہ انہیں عورتوں کے حقوق کے بارے میں توجہ دلا کر ان تعلیمات کی بنیاد پر عدل و انصاف اور اخلاقی فضا قائم کرسکیں اور من مانیوں اور خود خواہی سے پرہیز کریں۔ قرآن مجید اس سلسلہ میں، یعنی مردوں کے عورتوں سے برتاو کے بارے میں، مردوں کو حاصل حقوق سے بہرہ مند ہونے کے پیش نظر چند اصولوں کی طرف اشارہ فرماتا ہے:

ا۔ عدل و انصاف پر مبنی برتاو: اسلام میں قانون سازی کی بنیاد عدل و انصاف پر

مبنی ہے۔[16] دین اسلام نے انسانوں کی سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں میں، من جملہ حکومتی یا اجتماعی جہات سے عدل و انصاف کی رعایت کرنے کی سفارش کی ہے۔[17]

خاندان میں مرد کی مدیریت، جو معاشرہ میں وسیع پیمانہ پر مدیریت و حاکمیت کا ایک چھوٹا نمونہ ہے، اسی اصول پر مبنی ہے، یعنی مرد گھر کے ماحول میں مختلف جہات سے نظم و انتظام اور ہم آہنگی برقرار کرنے کی مسئولیت کے علاوہ، عدل و انصاف کو نافذ کرنے والا بھی شمار ہوتا ہے۔ حقیقت میں مرد حکومت کرنے کا حق رکھتا ہے، لیکن تحکم کا حق نہیں رکھتا ہے، (اسلام میں) حکومت یعنی عدل و انصاف پر مبنی نظم و نسق چلانا اور تحکم یعنی زور زبردستی سے کام لینا، اسلام نے مرد کو زور زبردستی کرنے کا حق نہیں دیا ہے، بلکہ اسے حکومت کرنے کا حق سونپا ہے، کہ جو ایک فریضہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے تاکہ اس پر مبنی ضرورتوں کے مطابق خاندان کا نظم و نسق چلائے۔ وہ خاندان کا سرپرست ہے، یعنی حق رکھتا ہے کہ خاندان کی مصلحتوں کی حد میں امر و نہی کرے، لیکن زور زبردستی کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے، یعنی اسے حق نہیں ہے کہ خاندان کی مصلحتوں کے خلاف عمل کرے۔[18]

اس لئے مرد کو عدل و انصاف اور خدا کی رضامندی پر مبنی سرپرستی کرنے کا حق ہے۔ بہت سی آیات میں عورتوں کے ساتھ ظلم کرنے اور ایام جہالت کے رسوم کے مطابق برتاو کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اور انہیں ان کے حقوق ادا کرنے کی فہمائش کی گئی ہے۔[19]

۲۔ حسن سلوک کے اصول کی رعایت: قرآن مجید نے متعدد آیات میں اور مختلف مناسبتوں سے حسن سلوک کے مسئلہ کی یاد دہانی کی ہے اور مرد اور عورت میں سے ہر ایک کو اس اصول کی رعایت کرنے کی فہمائش کی ہے۔ حسن سلوک کے اصول سے متعلق آیات کے بارے میں تحقیق کرنے کے دوران ہمیں ایسی باتیں ملتی ہیں، جن میں زندگی کے مختلف مراحل

میں مردوں کی طرف سے عورتوں کے ساتھ تعامل کے طریقہ کار پر عمل کرنے کا اشارہ کیا گیا ہے۔ من جملہ ازدواج، طلاق،[20] معاشرت[21]، مہر جیسے[22] ان کے مالی حقوق ادا کرنے، اور بچے کو دودھ[23] پلانے جیسے امور بیان کئے گئے ہیں، اور مردوں کو حسن سلوک کے اصول کے برخلاف عورت پر اپنے نظریات کو زور زبردستی سے منوانے کا حق نہیں ہے۔

لفظ معروف (حسن معاشرت) ہر اس امر کے معنی میں ہے کہ لوگ اپنے معاشرہ میں اسے جانتے ہیں، اور اس سے انکار نہیں کرتے ہیں اور اس کے بارے میں بے خبر نہیں ہیں اور چونکہ خداوند متعال نے عورتوں کے ساتھ معاشرت کرنے کے حکم میں معروف (حسن معاشرت) کی قید سے مقید کیا ہے، اس لئے عورتوں سے معاشرت کرنے کا حکم ایک ایسی معاشرت ہے کہ اس حکم پر عمل کرنے والے، یعنی مسلمانوں کے درمیان معروف ہو۔[24]

البتہ لفظ معروف قانون مندی اور عدل و انصاف سے وسیع تر معنی رکھتا ہے۔ اسی طرح قانون اور عادلانہ حق پر بھی مشتمل ہے، اور قابل قدر اور اخلاقی کام بھی اس میں شامل ہوتے ہیں، یعنی خداوند متعال خاندان کی سرپرستی کو مردوں کے حوالہ کرتے ہوئے خاندان کے ماحول میں عدل و انصاف پر مبنی حسن معاشرت اور اخلاق پر مبنی قابل قدر برتاو کی سفارش کرتا ہے۔

اس لئے حسن سلوک کی بنیاد پر عورتوں کے ساتھ معاشرت کرنا، یعنی عدل و انصاف پر مبنی برتاو کرنا ہے[25] اور بہ الفاظ دیگر یہ ایک ایسا حسن معاشرت ہونا چاہئے جو خدا کے حکم اور عورتوں کے حقوق کو ادا کرنے کی بنیاد پر ہو۔

۳۔ مودت ورحمت کا اصول: مرد کی حکمرانی ہر قسم کی زور زبردستی سے عاری، مودت و رحمت پر مبنی ہونی چاہئے۔ قرآن مجید اس سلسلے میں ارشاد فرماتا ہے: اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارا جوڑا تمہیں میں سے پیدا کیا ہے تا کہ تمہیں اس

سے سکون حاصل ہو اور پھر تمہارے درمیان محبت اور رحمت قرار دی ہے کہ اس میں صاحبان فکر کے لئے بہت سی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔[26] مودت کی بنا پر مرد کا حسن سلوک اور نیک برتاو، اس کی شریک حیات کے لئے موثر ترین عامل ہے۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر خداوند متعال نے مردوں اور عورتوں میں سے ہر ایک کو کچھ توانائیاں عطا کی ہیں اور ان توانائیوں کی بنیاد پر کچھ متقابل حقوق اور وظائف مقرر کئے ہیں۔ اسی طرح خداوند متعال نے اپنی حکمت کے پیش نظر عورتوں کی بہ نسبت مردوں کو بعض بیشتر توانائیاں عطا کی ہیں اور اس برتری کی بنیاد پر خاندان کی سرپرستی کی مسئولیت مردوں کو عطا کی ہے۔ اگر اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ یہ برتری مرد کے لئے ایک فریضہ کو قبول کرنے کا سبب بنی ہے تا کہ اس کے ذریعہ خاندان کا نظم ونسق چلا سکے۔ اس کے لئے یہ کوئی امتیاز نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ حکم رانی کرے اور اس پر فخر ومباہات کرے۔

حواشی

[1] اسراء، 70.

[2] نحل، 71.

[3] بقرہ، 47.

[4] بقرہ، 253.

[5] نساء، 34.

[6] انعام، 132.

[7] ابن کثیر دمشقی، اسماعیل بن عمر، تفسیر القرآن العظیم، ج 1، ص 45، منشورات محمد علی بیضون، دار الکتب العلمیۃ، بیروت.

طبع اول، 1419ھ.

[8] نجفی خمینی، محمد جواد، تفسیر آسان، ج 2، ص 62، انتشارات اسلامی، تہران، طبع اول 1398ھ.

[9] مکارم شیرازی ناصر،تفسیر نمونہ، ج 2،ص 158، دار الکتب ال إسلامی،تہران،طبع اول 1374 ہ ش.

[10] موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ترجمہ المیز ان، ج 12،ص 42، دفتر انتشارات اسلامی جامعۃ مدرسین حوزہ علمیہ قم،قم،طبع پنجم 1374ھ ش.

[11] اسراء،20.

[12] ابراہیمؑ،7.

[13] حجرات،13.

[14] اسراء،37.

[15] حجرات،11.

[16] نساء،135.

[17] اعراف،29.

[18] مطہری،مرتضی،مجموعہآ ثار، ج 21،ص 117.

[19] نساء،19.

[20] بقرہ،231.

[21] نساء،19.

[22] بقرہ،236.

[23] بقرہ،233.

[24] طباطبایی،محمد حسین،تفسیر المیز ان،موسوی ہمدانی سید محمد باقر،ج 4،ص 405، دفتر انتشارات اسلامی جامعۃ مدرسین حوزہ علمیہ قم،قم،طبع پنجم 1374 ہ ہش

[25] فیض کاشانی، ملا محسن،تفسیر صافی، ج 1 ص 434، انتشارات الصدر، تہران،طبع دوم، 1415 ہ.

[26] روم،21.

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۳ اور سورہ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کی کیسے توجیہ کی جاسکتی ہے؟

خداوند متعال ایک بار سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۳ میں اعلان فرماتا ہے کہ دودھ پلانے کی مدت پورے دوسال ہے (حولین کاملین)۔لیکن سورہ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ حاملگی اور دودھ پلانے کی مجموعی مدت ۳۰ مہینے بیان کی گئی ہے (ثلاثون شہرا) چونکہ حاملگی کی مدت ۹ مہینے ہے، اس لئے قدرتی طور پر دودھ پلانے کی مدت ۲۱ مہینے ہونی چاہئے، نہ کہ ۲۴ مہینے یا پورے دوسال۔ ان دو آیات کے درمیان اختلاف کی کیسے توجیہ کی جاسکتی ہے؟

مختصر جواب

اگر دوسال دودھ پلانے کی مدت، واجبی حکم ہو، تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حاملگی کے نومہینوں اور دودھ پلانے کے ۲۴ مہینوں کا مجموعہ ۳۳ مہینے ہے، نہ ۳۰ مہینے جیسے قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ دودھ پلانے کی یہ مدت واجب نہیں ہے، بلکہ یہ ان ماوں کے لئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت کو خاتمہ بخشنا چاہتی ہیں۔ اس بنا پر مذکورہ آیت کے ذیل میں

بیان کئے گئے شرائط کے تحت بچے کا دودھ بند کرنا جائز ہے۔ پس جس عورت کا وضع حمل ۹ مہینے کے بعد ہوتا ہے، وہ ۲۱ مہینے تک اپنے بچے کو دودھ پلاسکتی ہے (دودھ پلانے کی کم از کم جائز مدت) اور اس طرح حاملگی اور دودھ پلانے کی مجموعی مدت ۳۰ مہینے ہوگی، جو سورہ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ کی مصداق ہے۔ دودھ پلانے کی مدت پورے دوسال واجب ہونے کے فرض پر، ضروری نہیں ہے کیونکہ حاملگی کی مدت مختلف ہوتی ہے۔ اس بنا پر جو عورت چھ مہینے کی مدت میں وضع حمل کرتی ہے اور ۲۴ مہینے تک اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے، وہ اس آیہ شریفہ کے لئے ایک دوسری مثال ہے دودھ پلانے کی مدت دو سال بیان کرنے والی سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۳ اور سورہ لقمان کی آیت نمبر ۱۴ کو حاملگی اور دودھ پلانے کی مجموعی مدت کو ۳۰ ماہ بیان کرنے والی سورہ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ کے ساتھ قرار دیکر، جب ہم ۳۰ مہینے سے ۲۴ مہینے کم کرتے ہیں، تو باقی ۶ مہینے بچتے ہیں، جو حاملگی کی سب سے کم مدت ہے۔ مذکورہ دو آیتوں کے درمیان اس وقت اختلاف پیدا ہوسکتا ہے، جب دو سال دودھ پلانے کی مدت اور ۹ ماہ حاملگی کی مدت واجب اور نا قابل تغیر ہو۔

تفصیلی جواب

ا۔ ماوں کو اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلانا چاہئے۔[1] کیا دو سال تک بچے کو دودھ پلانا، واجب ہے؟

مذکورہ آیہ شریفہ وجوب کی دلیل پیش نہیں کرتی ہے، کیونکہ اس کے ضمن میں ارشاد ہوتا ہے: وہ مائیں جو رضاعت کو پورا کرنا چاہیں یعنی دودھ پلانے کی مدت کا تعلق ماں کی مرضی اور ارادہ سے ہے، پس معلوم ہوتا ہے کہ، دودھ پلانے کی مدت واجب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ارشاد ہوتا ہے: ایک دوسرے کے ساتھ صلاح و مشورہ کرنے اور رضا مندی کی صورت میں، بچے کو دودھ پلانا بند کیا جاسکتا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ اس مدت کو بیان کرنے

سے مراد، واجب نہیں ہے۔[2] ماوں کو حق ہے کہ وہ اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں، جب وہ دودھ پلانے کی پوری مدت (دو سال) سے استفادہ کرنا چاہیں۔ دو سال پورے ہونے سے پہلے بچے کو دودھ پلانا بند کرنا جائز ہے، لیکن اس کام کے لئے والدین کی رضا مندی کافی نہیں ہے، بلکہ اس سلسلہ میں صلاح ومشورہ کیا جانا چاہئے تاکہ بچے کے حق کو بھی تحفظ ملے اور ماں باپ کے حقوق کی بھی رعایت ہو جائے۔ مستحب ہے کہ دودھ پلانے کے لئے معین کی گئی پوری مدت تک ماں اپنے بچے کو دودھ پلائے اور وہ پورے دو سال ہیں اور اگر وہ اس سے کم مدت تک دودھ پلانا چاہتی ہو، تو اس کے لئے کم سے کم مدت ۲۱ مہینے جائز ہے۔[3]

۲۔کیا اس حکم میں سب بچے مشترک ہیں؟ ابن عباس جیسے بعض مفسرین اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ مدت (دو سال) ہر پیدا ہونے والے بچے کے لئے ثابت نہیں ہے اور یہ صرف اس بچے کے لئے ہے جو چھ مہینے کا پیدا ہو جائے۔[4] ابن عباس کی دلیل سورہ احقاف کی آیت نمبر ۹۵ ہے (ثلاثون شہرا)، یہ آیہ شریفہ دلالت کرتی ہے کہ حاملگی اور دودھ پلانے کا زمانہ ۳۰ مہینے ہے، پس جس قدر حاملگی کا زمانہ کم تر ہو ہم اسی حساب سے دودھ پلانے کی مدت میں اضافہ کرسکتے ہیں تاکہ دونوں ملا کر زمانہ پورا (۳۰ ماہ) ہو جائے اور جس قدر حاملگی کا زمانہ زیادہ ہو تو اسی حساب سے دودھ پلانے کی مدت سے کم کرسکتے ہیں۔[5]

۳۔حاملگی کی سب سے کم تر مدت کتنی ہے؟ شیخ مفید اپنی کتاب الارشاد میں نقل کرتے ہیں کہ: عمر بن خطاب کی خلافت کے دوران، ایک ایسی عورت کو ان کے پاس لایا گیا، جس نے شادی کے چھ مہینے بعد بچے کو جنم دیا تھا، عمر اسے (زنا کے الزام میں) سنگسار کرنا چاہتے تھے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ ان کے اس کام میں رکاوٹ بنے اور آپؑ نے اس آیہ شریفہ کی بنا پر ثابت کیا کہ ممکن ہے یہ بچہ اس عورت کے اپنے شوہر کا ہو اور وہ عورت زنا

کی مرتکب نہ ہوئی ہو۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: خدا وند متعال، عورت کی حاملگی کی ابتدا سے بچے کو دودھ پلانے کی آخری مدت تک ارشاد فرماتا ہے: حاملگی اور دودھ پلانے کی مجموعہ مدت تیس مہینے ہے۔ اور دودھ پلانے کی مدت کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے: پورے دو سال ہے، پس جب کوئی عورت اپنے بچے کو پورے دو سال دودھ پلائے (اور دوسری جانب سے) حاملگی اور دودھ پلانے کی مجموعی مدت تیس مہینے ہو، تو نتیجہ کے طور پر حاملگی کی مدت چھ مہینے ہوگی۔ عمر بن خطاب نے اس بیان کو سننے کے بعد اس عورت کو رہا کیا اور اسلام میں اس حکم کو درج کیا اور پیغمبر (ص) کے اصحاب اور ان کے بعد آنے والوں نے ہمارے زمانہ تک اس حکم پر عمل کیا ہے۔[6]

علامہ طباطبائی نے اپنی تفسیر میں اس روایت کو الدرالمنثور [7] سے نقل کیا ہے۔ اور علامہ، سورہ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ اور سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۳ اور سورہ لقمان کی آیت ۱۴ سے نتیجہ نکالتے ہیں کہ حاملگی کی کم از کم مدت چھ مہینے ہے۔ اس بنا پر تیس مہینوں میں سے دو سال کم کر کے معلوم ہوتا ہے کہ حاملگی کی کم سے کم مدت چھ مہینے اور دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ مدت، جس کے بارے میں شرعی حکم ہے، ۲۴ مہینے ہیں۔ اگر بچہ ماں کے پیٹ میں سات مہینے، یا آٹھ مہینے یا نو مہینے رہے، تو بچے کے پیدا ہونے کے بعد دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ مدت بالترتیب تیئس مہینے، بائیس مہینے اور اکیس مہینے ہے۔ شیخ طوسی اور امین الاسلام طبرسی ابن عباس کا قول ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: جن روایتوں کو ہمارے علماء نے نقل کیا ہے وہ اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ انہوں نے روایت کی ہے کہ ۲۱ مہینے سے کم مدت تک بچے کو دودھ پلانا بچے پر ظلم (وستم) ہے۔[8]

۴۔ روایات کے مطابق دودھ پلانے کی کم سے کم مدت:

کتاب وسائل الشیعہ کی مندرجہ ذیل دو روایتوں کی بنا پر، دودھ پلانے کی کم از کم

مدت ۲۱ مہینے ہوسکتی ہے اوراس سے کم تر جائز نہیں ہے:

الف) امام صادقؑ نے فرمایا ہے: دودھ پلانے کی واجب مدت، ۲۱ مہینے ہے۔ پس جو عورت اس سے کم مدت تک دودھ پلائے، اس نے کوتاہی کی ہے اور اگر وہ دودھ پلانے کی پوری مدت پورا کرنا چاہتی ہے،تو اس سے پورے دوسال مراد ہیں۔[9]

ب) حضرت صادقؑ نے ہی مزید فرمایا ہے: دودھ پلانے کی مدت ۲۱ مہینے ہے، پس اس سے کم تر بچے پرظلم (وستم) شمار ہوگا۔[10]

۵۔رضاعت(دودھ پلانے) میں بچوں کا اشتراک: مفسرین کے ایک گروہ کا اعتقاد ہے کہ دوسال تک دودھ پینا تمام بچوں کے لئے ثابت ہے اس حکم کا صرف شش ماھہ پیدا ہونے والے بچوں سے مخصوص ہونا ظاہر آیت کے موافق نہیں ہے۔ بظاہر: آیہ شریفہ: الوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین۔۔۔ پیدائش کے بعد پورے دو سال تک دودھ پلانے کے حق کو ثابت کرتی ہے اور بچے کا ماں کے رحم میں رکنا اور وہاں پرتغذیہ ہونا کوئی معیار نہیں ہے، پس تمام بچوں کا حق ہے کہ پورے دوسال تک ماں کا دودھ پی لیں اور ماں کو حق ہے کہ اپنے بچے کو پورے دوسال تک دودھ پلا دے۔[11]

۶۔نتیجہ:

لفظ یرضعن ایک ایسی خبر ہے،جس سے امر کے معنی سمجھے جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ امر مستحب ہے۔لفظ والدات تمام ماوں کے حالات پر مشتمل ہے، جو حسب ذیل ہیں:

وہ مائیں، جو شش ماھہ یا ہفت ماھہ یا ہشت ماھہ اور یا نو ماھہ وضع حمل کرتی ہیں۔لفظ اولاد تمام بچوں پر مشتمل ہے، جو: شش ماھہ، ہفت ماھہ، ہشت ماھہ اور یا نو ماھہ پیدا ہوتے ہیں، مذکورہ مطالب کی بنا پر آیہ شریفہ دودھ پلانے کا حکم بیان کرتے ہوئے، اس حکم میں تمام بچوں کو مساوی جانتی ہے،یعنی انہیں دو سال تک دودھ پینا چاہئے،لیکن یہ حکم

مستحب ہے، پس اگر کم از کم مدت تک دودھ پلانے پر اکتفا کیا جائے، تو سورہ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ کا مصداق ہے، یعنی دودھ پلانے کا کم از کم زمان، ۹ مہینے کی حاملگی کی مدت کو ملا کر مجموعہ ۳۰ مہینے ہوتا ہے۔ اور اگر بچہ دو سال تک دودھ پی لے تو سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۲ کے مستحب حکم پر عمل ہوا ہے، کہ سورہ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ سے کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ حتمی طور پر دو سال تک دودھ پلانا واجب نہیں ہے اور اس آیت سے دودھ پلانے کی کم ترین مدت کا مطلب نکالا جا سکتا ہے۔ پس اگر ارشاد فرماتا کہ: دو سال تک دودھ پلانا واجب ہے اور اس کے بعد فرماتا: حاملگی اور دودھ پلانے کی مجموعی مدت ۳۰ مہینے ہے، تو اس میں تناقض واضح تھا۔ اس بنا پر تیس مہینوں کا ایک مصداق وہ بچہ ہے جو شش ماھہ پیدا ہوا ہے اور پورے دو سال تک دودھ پیتا ہے۔ حاملگی کا کم از کم زمان + دودھ پلانے کا زیادہ سے زیادہ = ۳۰ مہینے (۳۰ = ۶ + ۲۴) اور دوسرا مصداق وہ بچہ ہے جو ۹ ماھہ پیدا ہوا ہے اور ۲۱ مہینے تک دودھ پیتا ہے، یعنی (کم از دودھ پینے کی مدت + متعارف حاملگی = ۳۰ مہینے (۳۰=۹+۲۱)

حواشی

[1] بقرہ، 233.

[2] فخر رازی، تفسیر کبیر، ج 6، ص 118، طبع دوم، دار الکتب العلمیۃ، تہران.

[3] شہید ثانی، شرح لمعہ، کتاب نکاح، باب الرضاع.

[4] علی فضل بن حسن، مجمع البیان فی تفسیر القران، ج 2، ص 171، طبع اول، سازمان اوقاف و خیریہ، انتشارات اسوہ، 1426ھ ۱۳۸۴ ہ؛ محمد بن حسن طوسی، التبیان فی تفسیر القران، ج 3، ص 373، طبع اول، مؤسسہ نشر اسلامی (جامعہ مدرسین).

[5][5] تفسیر کبیر، فخر رازی، ج 6، ص 118.

[6] شیخ مفید، الارشاد فی معرفۃ حجج اللہ علی العباد، ج 1، ص 197، ترجمۂ سید ہاشم رسولی محلاتی، ناشر: علمیۂ

اسلامیہ؛ دیلمی، ارشادالقلوب، ج2،ص6،طبع نجف، المطبعۃ الحیدریۃ.

[7] الدرالمنثور، ج6،ص40، بہ نقل از المیزان.

[8] مجمع البیان، ج2،ص171؛ تبیان، ج3،ص373.

[9] محمد بن الحسن، الحرالعاملی، وسائل الشیعۃ، ج21، ح27564،ص454،طبع 3،مؤسسۃ آل البیت علیہم السلام لاحیاء التراث، بیروت۔لبنان، 1429ھ.

[10] وسائل الشیعۃ، ج21،ص455، ح27567.

[11] جوادی آملی،عبداللہ،تسنیم، ج11،ص374،طبع اول، انتشارات اسراء،قم، اسفند1385ھ۔

سورہ مومنون کی آیت نمبر ۱۰۱ اور سورہ صافات کی آیت نمبر ۲۷ اور ۵۰ کے درمیان پائے جانے والے تناقض کو کیسے برطرف کیا جا سکتا ہے؟

انسانوں کے معاد کے سلسلہ میں سورہ مومنون کی آیت نمبر ۱۰۱ اور سورہ قصص کی آیت نمبر ۲۸ میں بیان کیا گیا ہے کہ: اس وقت کوئی شخص کسی دوسرے سے مدد کی درخواست اور سوال نہیں کرے گا (لا یسئلون) لیکن سورہ صافات کی آیت نمبر ۲۷ اور ۵۰ میں اور سورہ طور کی آیت نمبر ۲۵ میں اعلان کیا گیا ہے کہ ان میں سے بعض افراد ایک دوسرے سے سوال کر کے مدد کی درخواست کرتے ہیں (یتسائلون)، اس تناقض کو کیسے برطرف کیا جا سکتا ہے؟

مختصر جواب

قرآن مجید کی آیات میں عام طور پر اور مذکورہ آیات میں خاص طور پر کسی قسم کا تناقض اور تضاد نہیں پایا جاتا ہے، کیونکہ جن آیات میں فرمایا گیا ہے کہ اس دن کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے مدد کی درخواست اور سوال نہیں کرے گا، قیامت کے ابتدائی مراحل کی طرف اشارہ ہے اور یہ اس دن کی حیرت اور وحشت کی شدت کی وجہ سے ہے اور اسی شدت

اور خوف و وحشت اور پریشانی کا سبب ہوگا کہ اس دن انسان ایک دوسرے سے بھاگ رہے ہوں گے اور ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے ہوں گے۔ اس دن، انسان ایسے خوف و وحشت سے دو چار ہوگا کہ حساب و کتاب: اور الٰہی سزا کے بارے میں ڈر کی وجہ سے ایک دوسرے سے کسی صورت میں سوال نہیں کرے گا، لیکن جہاں پر انسانوں کے ایک دوسرے سے سوال کرنے کی بات کہی گئی ہے: وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ۝۲۷ یہ بہشت اور جہنم میں قیام پانے کے بعد کی بات ہے۔ اس بنا پر ان آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ مطابق کرنے اور ان پر غور فکر کرنے سے معلوم ہوگا کہ، ان کے درمیان کسی قسم کا تعارض نہیں پایا جاتا ہے۔

تفصیلی جواب

اس سوال کے جواب میں کہنا ہے کہ: قرآن مجید کی آیات میں جو یہ ظاہری تناقض پایا جاتا ہے، اس پر تھوڑی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے سے وہ تناقض برطرف ہوتا ہے اور جس طرح قرآن مجید کے معجزہ میں کہا گیا ہے کہ کوئی آیہ شریفہ دوسری کسی آیت کی نفی نہیں کرتی ہے اور یہ اس جاوید اور لافانی کتاب کے معجزات میں سے ایک ہے۔ یہ سوال اور ظاہری تناقض، قرآن مجید کے مفسرین کے ذہنوں میں بھی پیدا ہوا ہے اور تفسیر کی کتابوں میں اس پر بحث کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی بعض ایات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت برپا ہونے کے بعد لوگ ایک دوسرے سے سوال کریں گے، جیسے سورہ صافات کی آیت نمبر ۲۷ میں مجرموں کو دوزخ میں ڈالتے وقت ارشاد ہوتا ہے: وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ۝۲۷ اور ایک دوسرے کی طرف رخ کرکے (سرزنش آمیز) سوال کر رہے ہیں۔

اور اسی سورہ کی آیت نمبر ۵۰ میں بہشتیوں کی بات کرتے ہوئے اور دوسرے سے مخاطب ہو کر (دنیا کے اپنے دوستوں کے بارے میں، جو گمراہی کی وجہ سے راہ حق سے ہٹ

کر دوزخ میں گئے ہیں) سوال کرتے ہیں: فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ۞

اس کے مانند معنی، سورہ طور کی آیت نمبر ۲۵ میں بھی آئے ہیں۔ اس وقت سوال یہ ہے کہ یہ آیات مذکورہ آیت (سورہ مومنون کی آیت نمبر ۱۰۱) سے کیسے موافق ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ قیامت میں ایک دوسرے سے سوال نہیں کیا جاتا ہے؟

تمہید کے طور پر کہنا چاہئے کہ: لغت کی کتابوں میں، یتسائلون کو مادہ سوال سے ایک دوسرے سے سوال کرنے کے معنی میں بھی لیا گیا ہے اور مدد کی درخواست کرنے کے معنی کے طور پر بھی لیا گیا ہے۔[1]

قرآن مجید کی آیات پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن سوال کرنے اور سوال نہ کرنے کا مسئلہ سوال کے عنوان سے چھ آیتوں میں ذکر ہوا ہے کہ ان میں سے دو جگہوں پر لفظ لا یتسا ئلون [2]، یعنی سوال و درخواست نہ کرنے کے معنی میں آیا ہے اور چار جگہوں پر لفظ یتسا ئلون [3] یعنی مادہ سوال سے آیا ہے اور اس کے معنی ایک دوسرے سے سوال کرنا ہے۔

جاننا چاہئے کہ ان آیات میں کسی قسم کا تناقض و تضاد نہیں پایا جاتا ہے، کیونکہ جن آیات میں فرمایا گیا ہے کہ اس دن کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے سوال اور مدد کی درخواست نہیں کرتا ہے، وہ قیامت کے ابتدائی مراحل کی طرف اشارہ ہے اور یہ اس دن کی شدید حیرت و وحشت کی وجہ سے ہے اور اسی شدید وحشت اور پریشانی کی وجہ سے انسان ایک دوسرے سے بھاگ رہے ہیں اور ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے ہیں۔ اس دن انسان اس قدر خوف و وحشت سے دوچار ہوں گے کہ حساب و کتاب اور الٰہی عذاب کی شدت کے ڈر سے ایک دوسرے کے حالات کے بارے میں ہرگز سوال نہیں کریں گے، وہ دن ایک ایسا دن ہے کہ ماں اپنے شیر خوار بچے کو بھول جائے گی، اور بھائی اپنے بھائی کو بھول جاتا ہے۔

انسان مست جیسے دکھائی دیتے ہیں، جبکہ وہ مست نہیں ہوتے ہیں، چنانچہ سورہ حج کی ابتدا میں ارشاد ہوتا ہے: جس دن تم دیکھو گے کہ دودھ پلانے والی عورتیں اپنے دودھ پیتے بچوں سے غافل ہو جائیں گی اور حاملہ عورتیں اپنے حمل کو گرا دیں گی اور لوگ نشہ کی حالت میں نظر آئیں گے حالانکہ وہ بدمست نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی بڑا سخت ہوگا۔[4]اس مسئلہ کی ایک سادہ مثال سے عکاسی کی جاسکتی ہے۔ جب بھیڑیئے، گوسفندوں کے ایک ریوڑ پر حملہ آور ہوتے ہیں، تو ان میں ایسی وہشت پھیل جاتی ہے کہ بھیڑ ایک دوسرے سے جدا ہوکر اس طرح پراگندہ ہو جاتے ہیں کہ ہر بھیڑ صرف اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں ہوتا ہے۔۔۔ قیامت کے دن صور پھونکے جانے کے بعد انسانوں کی بھی یہی حالت ہوگی اور ہر فرد اپنے اعمال سے دو چار ہوگا اور اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں ہوگا ۔ بہ الفاظ دیگر، اضطراب اور خوف وہراس انہیں اس قدر پریشان کرے گا کہ وہ ایک دوسرے کو بالکل بھول جائیں گے۔ لہٰذا ان کے ذہنوں سے رشتہ داری اور جان پہچان جیسی چیزیں زائل ہوجائیں گی۔

لیکن جہاں پر انسانوں کے ایک دوسرے سے سوال کرنے کی بات ہے، وہاں پر قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے: واقبل بعضھم علی بعض یتسائلون۔۔۔ یہ سوال و جواب اور گفتگو انسانوں کے بہشت اور جہنم میں قیام کرنے کے بعد انجام پاتی ہے، قرآن مجید کی آیات کے مطابق خدا کے نیک بندے، بہشت کی معنوی اور مادی نعمتوں سے مالا مال ہوں گے اور بہشت کے تختوں پر تکیہ لگا کر اپنے دوست واحباب کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کرنے میں مشغول ہوں گے، ان میں سے کچھ لوگوں کو اچانک اپنے گزشتہ حالات اور دنیوی دوستوں کی یاد آئے گی، وہی دوست جنہوں نے اپنے راستہ کو جدا کیا ہے اور بہشتیوں میں شامل نہیں ہیں، وہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان کا انجام کہاں تک پہنچا۔ اس لئے ان میں بعض دوسروں کی

طرف رخ کر کے سوال کرتے ہیں: فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ﴿۵۰﴾[5]

اسی طرح جہنمی بھی ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں، جیسا کہ سورہ صافات کی آیت نمبر ۲۷ میں مجرمین کے دوزخ میں داخل ہوتے وقت ان کی باہمی گفتگو کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ﴿۲۷﴾ اور ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے (سرزنش آمیز) سوال کر رہے ہیں۔ ہر ایک اپنے گناہ کو دوسرے کے سر تھوپ دیتا ہے، اپنے سر پرستوں اور پیشواوں کو قصور وار قرار دیتے ہیں اور پیشوا اپنے پیرووں کو قصوروار قرار دیتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں: وہ ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں: وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ﴿۲۷﴾ سورہ صافات کی ۶۲ سے ۶۴ تک کی آیات بھی اسی مسئلہ کی حقیقت پیش کرتی ہیں: وہ کہتے ہیں: ہم کیوں ان لوگوں کو یہاں پر (دوزخ کی آگ میں) نہیں دیکھتے ہیں جنہیں ہم اشرار میں سے جانتے تھے۔۔۔ یہ دوزخیوں کی مخاصمانہ گفتگو کی ایک حقیقت ہے۔

اسی سلسلہ میں کچھ آیات پائی جاتی ہیں کہ جو یہ بتاتی ہیں کہ بہشتیوں اور جہنمیوں کے درمیان بھی گفتگو کا رابطہ بر قرار ہے، جہاں پر یہ ارشاد ہوتا ہے: فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ﴿۴۳﴾۔۔۔[6] وہ بہشت کے باغات میں ہیں اور مجرموں سے سوال کرتے ہیں کہ تم لوگوں کو کس چیز نے جہنم میں پہنچا دیا ہے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں نہیں تھے۔ اس بنا پر ان آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھنے اور ان پر غور و خوض کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کے درمیان کسی قسم کا تعارض نہیں پایا جاتا ہے۔ البتہ، ان آیات کو آپس میں جمع کرنے کے سلسلہ میں کچھ دوسرے نظریات بھی بیان کئے گئے ہیں، من جملہ یہ کہ سورہ مومنون کی آیت نمبر ۱۰۱ میں قیامت کے بارے میں دو مظاہر کی طرف

اشارہ کیا گیا ہے، ان میں سے ایک حسب ونسب کا بیکار ہونا ہے، کیونکہ اس دنیا کی رشتہ داریاں اورقبیلہ داریاں جولوگوں کی زندگی کے نظام پر حاکم ہیں، اس امر کا سبب بنتی ہیں کہ مجرم افراد بہت سی سزاوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور یا اپنی مشکلات کوحل کرنے میں اپنے رشتہ داروں سے مدد پہنچ جاتی ہے۔لیکن قیامت میں صرف انسان اور اس کے اعمال ہوتے ہیں اور کوئی شخص حتی کہ اپنے بھائی، فرزند اور باپ کا بھی دفاع نہیں کرسکتا ہے اور اس کی سزا کو بدل نہیں سکتا ہے۔اس بنا پر، جملہ ولا یتسائلون کے یہ معنی ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے مدد کی درخواست نہیں کرتے ہیں، کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں یہ درخواست کسی صورت میں ان کے لئے فائدہ بخش نہیں ہے[7] لیکن اس کے علاوہ دوسری گفتگوممکن ہے۔

خلاصہ

مذکورہ آیات کے مضمون پر دقت وغور کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہوگا، کیونکہ مذکورہ آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے سوال کرنا بہشت اور جہنم میں داخل ہونے کے بعد یا بہشت وجہنم میں داخل ہونے کے ابتدائی مرحلہ میں انجام پاتا ہے، جبکہ ایک دوسرے سے سوال نہ کرنا قیامت کے ابتدائی مراحل سے متعلق ہے،جس میں لوگ خوف و ہراس اور پریشانیوں سے دو چار ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو بالکل فراموش کردیتے ہیں اور یا بعض افراد کے اعتقاد کے مطابق، قیامت کے دن سوال نہ کرنا، درخواست نہ کرنے کے معنی میں ہے، نہ کہ دوسری گفتگوؤں کے بارے میں۔

حواشی

[1] ابن منظور، لسلن العرب، واژہ سئل؛....

[2] مؤمنون، 101؛ قصص، 66.

[3] صافات، 27، 50؛ طور، 25؛ مثر، 40.

[4] حج، 2 عَظِيمٌ ① يَوۡمَ تَرَوۡنَهَا تَذۡهَلُ كُلُّ مُرۡضِعَةٍ عَمَّآ أَرۡضَعَتۡ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمۡلٍ حَمۡلَهَا وَتَرَى ٱلنَّاسَ سُكَٰرَىٰ وَمَا هُم بِسُكَٰرَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ ٱللَّهِ شَدِيدٌ○

[5] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج 19، ص 61، دار الکتب ال اسلامیۃ، تہران، 1374 ھ ش

[6] مدثر، 40-43.

[7] تفسیر نمونہ، ج 14، ص 327.

کیا بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی سزا عاقلانہ تھی؟

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۵۴ میں ارشاد ہوتا ہے اور وہ وقت بھی یاد کرو جب موسیٰؑ علیہ السّلام نے اپنی قوم سے کہا کہ تم نے گوسالہ بنا کر اپنے اوپر ظلم کیا ہے. اب تم خالق کی بارگاہ میں توبہ کرو اور اپنے نفسوں کو قتل کر ڈالو کہ یہی تمہارے حق میں خیر ہے. پھر خدا نے تمہاری توبہ قبول کرلی کہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ قابل غور ہے کہ یہاں پر جہالت کے کفارہ کو جو کہا گیا ہے کہ بہترین کفارہ ہے، کیا ایک دوسرے کا قتل کرنا ایک عاقلانہ کام ہے کہ خداوند متعال نے بنی اسرائیل سے ایسا کرنے کو کہا ہے؟

مختصر جواب

مفسرین نے اس آیہ شریفہ میں قتل کرنے کے حکم کے بارے میں خداوند متعال کی مراد کے سلسلہ میں تین احتمالات بتائے ہیں

۱۔ یہ حکم، امتحانی حکم تھا، اور بنی اسرائیلیوں کے توبہ کرنے کے بعد اس حکم کو اٹھالیا گیا ہے۔

۲۔ اس آیہ شریفہ میں قتل سے مراد نفسانی شہوتوں اور شیطانی وسوسوں سے اجتناب کرنا ہے۔

۳۔ آیہ شریفہ میں قتل سے مراد، حقیقی معنوں میں قتل ہے، یعنی تم لوگ ایک دوسرے کو قتل اور ہلاک کر ڈالو، اور اس حکم کا فلسفہ ممکن ہے مندرجہ ذیل تمام مقاصد یا ان میں

سے کوئی ایک ہو:

الف: بنی اسرائیل کو کفر وشرک سے پاک کرنا۔

ب: اس قسم کے گناہ کبیرہ کو دہرانے سے روکنا۔

ج: توحید کے اصول سے منحرف ہوکر بت پرستی کی طرف میلان پیدا کرنے کے مسئلہ کی اہمیت۔

بہرصورت، شدید ترین سزاوں کو برداشت کرنا، دوزخ سے رہائی پانے کی قیمت ہوسکتی ہے۔

تفصیلی جواب

خداوند متعال ارشادفرماتا ہے: اور وہ وقت بھی یاد کرو جب موسیٰؑ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ تم نے گوسالہ بنا کر اپنے اوپر ظلم کیا ہے. اب تم خالق کی بارگاہ میں توبہ کرو اور اپنے نفسوں کو قتل کر ڈالو کہ یہی تمہارے حق میں خیر ہے. پھر خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی کہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔[1]

اس آیہ شریفہ میں جو خداوند متعال نے بنی اسرائیل کو ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے، اس کے بارے میں مفسرین نے مندرجہ ذیل تین احتمالات بیان کئے ہیں:

ا۔ اس آیہ شریفہ میں قتل کرنے کا حکم ایک امتحانی حکم تھا، جیسا کہ خداوند متعال نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قتل کئے جانے سے پہلے خطاب کیا: اے ابراہیمؑ تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا[2] حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان میں بھی خداوند متعال نے فرمایا: توبہ کرو اور ایک دوسرے کو قتل کرو کہ یہی تمہارے حق میں خیر ہے، لیکن خداوند متعال کے حکم کو مکمل طور پر عملی جامہ پہنانے سے پہلے خداوند متعال نے بعض لوگوں کے قتل کو تمام لوگوں کے قتل کے برابر شمار کیا اور ان کی توبہ قبول کی۔[3]

۲۔ اس آیہ شریفہ میں قتل سے مراد نفسانی شہوتوں اور شیطانی وسوسوں سے اجتناب کرنا ہے، اور آیہ شریفہ کے معنی یہ ہیں کہ نفسانی شہوتوں اور شیطانی وسوسوں کو اپنے سے دور کرو اور پورے خلوص کے ساتھ خدا کی وحدانیت کا اقرار اور اعتراف کرو۔ [4]

۳۔ آیہ شریفہ میں قتل سے مراد، حقیقی معنوں میں قتل ہے، یعنی ایک دوسرے کو قتل اور ہلاک کرو۔ [5] کیونکہ یہ قتل ہونا تمہارے لئے دنیوی زندگی سے بہتر ہے۔

جنہوں نے کہا ہے کہ قتل سے خداوند متعال کی مراد حقیقی معنوں میں قتل کرنا ہے، انہوں نے اس قتل کے بارے میں خداوند متعال کے حکم کے سلسلہ میں کچھ فلسفے بیان کئے ہیں کہ ہم ذیل میں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الف: یہ قتل ہونا، بنی اسرائیل کے شرک و کفر سے پاک ہونے اور انہیں جاودان اور ابدی زندگی ملنے کا سبب بن جاتا ہے۔ [6]

ب] انسان کو قتل کرنا، اگرچہ ایک برا اور حرام کام ہے، لیکن کبھی بعض مصلحتوں کے پیش نظر یہی کام نیک اور واجب بن جاتا ہے اور ایک قسم کی دینی اور اجتماعی مصلحت اس کے عنوان کو بدل دیتی ہے بنی اسرائیل کے بارے میں بھی چونکہ ان کا قتل ہونا اس قسم کے گناہ کبیرہ کو دہرانے سے روکنا تھا، اس لئے یہ ایک نیک کام اور ایک پسندیدہ حکم شمار ہوتا ہے۔ [7]

ج) سامری کے گوسالہ کی پرستش کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا جب ایک پوری قوم، خداوند متعال کی تمام آیات اور اپنے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عام معجزات کا مشاہدہ کرنے کے بعد، سب کچھ بھول کر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک مختصر غیر حاضری کے نتیجہ میں توحید کے بنیادی اصول اور دین خدا کو پائمال کر کے بت پرست بن جائے اور اگر یہ موضوع ہمیشہ کے لئے ان کے ذہن سے نابود نہ ہوجائے تو ایک خطرناک حالت رونما ہوگی، اور ممکن

ہے ہر فرصت کے بعد خاص کر حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد ان کی دعوت کی تمام آیات نابود ہوں گی۔ اور ان کے دین کا انجام مکمل خطرہ سے دوچار ہوگا اس لئے یہاں پر سخت رویہ اختیار کرنا چاہئے اور پشیمانی اور زبانی توبہ پر ہرگز قناعت نہیں کرنی چاہئے لہٰذا خداوند متعال کی طرف سے ایک شدید حکم صادر ہو رہا ہے جس کی انبیاء کی پوری تاریخ میں مثال نہیں ملتی ہے، اور وہ یہ کہ توبہ کر کے توحید کی طرف پلٹنے کے حکم کے ضمن میں گناہگاروں کی ایک بڑی تعداد کو ایک خاص صورت میں (اپنے ہاتھوں) اجتماعی طور پر قتل کرنے کا حکم صادر ہوا ہے۔

ان سزاؤں کے شدید ہونے کی وجہ یہ ہے کہ توحید کے اصول سے منحرف ہونا اور بت پرستی کی طرف جانا کوئی سادہ مسئلہ نہیں تھا کہ اس سے آسانی کے ساتھ چشم پوشی کی جائے وہ بھی ان سب واضح معجزات اور خدا کی بڑی نعمتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد حقیقت میں تمام ادیان الٰہی کے تمام اصولوں کو توحید اور یکتا پرستی میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے، اس اصول کے بارے میں تذبذب دین کے تمام اصولوں کے نابود ہونے کے مترادف ہے، اگر گوسالہ پرستی کے بارے میں سادگی کے ساتھ چشم پوشی کی جاتی تو، شاید آنے والوں کے لئے ایک سنت بن جاتی، خاص کر جبلی تاریخی شواھد کے مطابق بنی اسرائیل ہٹ دھرم اور بہانہ باز تھے، لہٰذا ان کی ایک ایسی تنبیہ کی جانی چاہئے تھی کہ جس کی یاد رہتی دنیا تک باقی رہتی کہ اس کے بعد کوئی بت پرستی کا تصور بھی نہ کر سکے، شاید: ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ○ [یہ قتل عام آپ کے پروردگار کے پاس آپ کے لئے بہتر ہے] کا جملہ اس معنی کی طرف اشارہ ہے۔[8]

آخر میں اس نکتہ کو بیان کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی شدید ترین سزائیں آخرت کی معمولی ترین سزاوں کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہیں اور اسی بناء پر، اگر انسان دنیا میں سخت ترین سزاوں کو برداشت کر کے قیامت کی طاقت فرسا سزاوں سے اپنے آپ کو نجات دلا سکے تو اس نے بیشک ایک سودمند معاملہ کیا ہے اور ہمارا اعتقاد ہے کہ اس دنیا میں خدا کی طرف

سے حدود اور سزائیں ان افراد کے گناہوں کا کفارہ ہوں گی، جنہوں نے دل سے توبہ کی ہو۔

مندرجہ ذیل روایت پر توجہ فرمائیے:

چوروں کے ایک گروہ کو امیر المومنینؑ کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔

مولا نے اس گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد کا ہاتھ کاٹ دیا اس کے بعد ان چوروں کو ایک مناسب جگہ پر لے جا کر حکم دیا کہ ان کے لئے ضروری معالجہ کا اقدام کیا جائے اور اس کے بعد، ان سزا یافتہ افراد کی گوشت وشہد جیسی لذیذ غذاوں سے خاطر تواضع کی اور ان سے مخاطب ہوکر فرمایا:: اے گناھگارو اس وقت تم لوگوں کے ہاتھ جہنم میں داخل ہوئے ہیں، البتہ اگر تم لوگ توبہ کرو گے اور خدا جان لے کہ تم لوگ اپنی توبہ میں سچے ہو، تو تمہارے ہاتھوں کو جہنم سے نجات ملے گی اور تم لوگ انہیں اپنے ساتھ بہشت میں لے جاو گے، اگر ایسا نہ کیا تو تمہارے کٹے ہوئے ہاتھ تمہیں اپنے ساتھ جہنم میں لے جائیں گے۔[9]

بنی اسرائیل کے مقتولین کے بارے میں بھی مندرجہ ذیل دو احتمال میں سے ایک ممکن ہے:

۱۔ یا انہوں نے توبہ کی ہے اس صوت میں وہ ابدی بہشت میں داخل ہوں گے، وہاں تک پہنچنے میں ہر قسم کی سختی برداشت کرنا قابل قدر ہے۔

۲۔ یا وہ اپنے باطل عقیدہ پر پابند رہے ہیں تو اس صورت میں نشانیوں اور معجزوں کا مشاہدہ کرنے کے باوجود ان کے باطل عقیدہ پر باقی رہنے کے پیش نظر ان کے لئے موت کی سزا بھی کم ہے۔

حواشی

[1] بقرہ،54: وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اِنَّكُمۡ ظَلَمۡتُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ بِاتِّخَاذِكُمُ الۡعِجۡلَ فَتُوۡبُوۡٓا اِلٰى بَارِئِكُمۡ فَاقۡتُلُوۡٓا اَنۡفُسَكُمۡ ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ عِنۡدَ بَارِئِكُمۡ ؕ فَتَابَ

عَلَيْكُمْ ۗ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾

[2] صافات، 105: يَا إِبْرَاهِيمُ ﴿١٠٤﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ

[3] موسوی ہمدانی سید محمد باقر، ترجمہ المیز ان، ج1، ص: 288 (با اندکی تصرف) نشر: انتشارات اسلامی جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم، 1374 ش

طبع: پنجم

[4] کاشانی ملا فتح اللہ، تفسیر منہج الصادقین فی اِلزام المخالفین، ج1، ص: 192، نشر کتابفروشی محمد حسن علمی، تہران، سال چاپ: 1336 ش

[5] تفسیر منہج الصادقین فی اِلزام المخالفین، ج1، ص: 192

[6] تفسیر منہج الصادقین فی اِلزام المخالفین، ج1، ص: 192

[7] ترجمہ مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج1، ص: 179 تحقیق: رضا ستودہ،، انتشارات فراہانی، تہران، 1360 ش، چاپ: اول

[8] مکارم شیرازی ناصر، تفسیر نمونہ، ج1، ص: 256، نشر دار الکتب ال اِسلامیۃ، تہران، 1374 ش، چاپ: اول

[9] کلینی، محمد بن یعقوب، کافی، ج7، ص266، ح31، دار الکتب ال اِسلامیۃ، تہران، 1365 ہ ش.

خداوند متعال نے کیوں زیادہ تر مادی نعمتوں سے بہشت کی توصیف کی ہے؟

خداوند متعال نے کیوں اس قدر مادی نعمتوں سے بہشت کی توصیف کی ہے اور اپنے بندوں کو اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے معنوی پہلو کو کم اہمیت دی ہے؟

مختصر جواب

قرآن مجید میں بہشت وجہنم کو خداوند متعال نے مادی اوصاف سے بھی یاد کیا ہے اور روحانی اور معنوی اوصاف سے بھی مادی نعمتوں سے توصیف اس لحاظ سے کی گئی ہے کہ بہت سے لوگوں کے لئے روحانی اور معنوی نعمتوں کی توصیف سے پہچان حاصل کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے کیونکہ انسانوں کے ذہن زیادہ مادیات سے مانوس ہوتے ہیں اور اس وجہ سے بہشت کے بلند معنوی مقامات کو سمجھنے سے قاصر اور عاجز ہیں۔

تفصیلی جواب

قرآن مجید نے کبھی مادی اوصاف سے بہشت وجہنم کی توصیف کی ہے اور کبھی ان کی روحانی اور معنوی اوصاف سے توصیف کی ہے کبھی بہشتی باغوں لذت بخش سایوں، مختلف قسم کے کھانوں اور برتنوں، پاک و طاہر شراب زینت بخش اور فاخر لباس، خوبصورت بیویوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور کبھی رضوان الٰہی، باطنی نشاط وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ معنوی اور روحانی

بہشت، رتبہ اور مقام کے لحاظ سے مادی بہشت کی بہ نسبت بلند ہے کیونکہ خداوند متعال سورہ توبہ میں مادی نعمتوں کو بیان کرنے کے فورا بعد ارشاد فرماتا ہے: **و رضوان من اللہ اکبر** یعنی پروردگار کے رضوان اور خوشنودی کا مقام ان مذکورہ نعمتوں سے بالاتر ہے[1]۔

لیکن بہشت کے بعض معنوی مراتب بعض مومنین کے لئے مخصوص ہیں نہ کہ تمام مومنین کے لئے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: کیا ان میں سے ہر ایک کی طمع یہ ہے کہ اسے جنت النعیم میں داخل کر دیا جائے، ہرگز نہیں، انہیں تو معلوم ہے کہ ہم نے انہیں کس چیز سے پیدا کیا ہے [2]

بہشتیوں کے مراتب اور ان کی نعمتوں میں تفاوت کے پیش نظر، بہشت کو قرآن مجید میں چار ناموں سے یاد کیا گیا ہے، جنت عدن، جنت فردوس، جنت نعیم اور جنت ماوی۔ امام باقر علیہ السلام سے نقل کی گئی ایک روایت میں آیا ہے کہ: جن بہشتوں کا قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے وہ بہشت عدن، بہشت فردوس، بہشت نعیم اور بہشت ماوی ہیں [3]

قرآن مجید میں بہشت کی مادی نعمتوں سے بھی توصیف کی گئی ہے اور معنوی نعمتوں سے بھی، لیکن یہ کہ بہشت کی زیادہ تر مادیات سے توصیف کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ انسانوں کے ذہن زیادہ تر مادیات اور دنیوی امور سے مانوس ہیں اس لئے بہت سے لوگوں کے لئے معنوی اورصاف سے بہشت کو پہچاننا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے اور اکثر انسان بہشت کے بلند مقامات اور درجوں کو معنوی توصیف سے پہچاننے میں عاجز ہیں۔

قرآن مجید اس سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے: پس کسی نفس کو نہیں معلوم ہے کہ اس کے لئے کیا کیا خنکی چشم کا سامان چھپا کر رکھا گیا ہے جو ان کے اعمال کی جزا ہے[4] اس طرح حدیث نبوی میں آیا ہے: پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے: میں نے اپنے بندوں کے لئے ایسی چیزیں فراہم کی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ ہی

انسان کے دل میں ان کا تصور پیدا ہوا ہے، [5]

اس لحاظ سے چونکہ بہشت کی معنوی نعمتوں کا تصور کرنا بہشت مشکل ہے اس لئے خداوند متعال نے تمام لوگوں کو اچھی طرح سمجھانے کے لے مادی نعمتوں کی توصیف سے استفادہ کیا ہے جو سب کے لئے قابل فہم ہیں اور معنوی اور روحانی نعمتوں کا خلاصہ کے طور پر ذکر کیا ہے۔

حواشی

[1] توبہ، 72.

[2] معارج، 38و 39، اَيَطۡمَعُ كُلُّ امۡرِیۡٴٍ مِّنۡهُمۡ اَنۡ يُّدۡخَلَ جَنَّةَ نَعِيۡمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ؕ

[3] کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، ج 8، ص 100، نشر اسلامیہ، تہران، 1362.

[4] سجدہ، 17، فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡيُنٍ ○

[5] علامہ مجلسی، محمد تقی، بحار الانوار، ج 8، ص 92، موسسۃ الوفاء، بیروت، 1404.

یہ دیکھتے ہوئے کہ خدا نظر نہیں آتا سورہ مطففین کی آیت نمبر ۱۵ "كَلَّآ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ" کی کیسے تفسیر کی جا سکتی ہے

مختصر جواب

لغت '' حجاب'' کا استعمال لازمی طور سے اس کے مادی معنی کے لئے نہیں ہے؛ کیونکہ عقلی و نقلی و پہلو سے ہم خدا کو مادی نہیں جان سکتے۔ لہٰذا لفظ '' حجاب'' کا استعمال مزکورہ آیت میں مادی معنی نہیں رکھتا جس طرح سے دوسری آیتوں میں بھی لفظ حجاب کا معنی مادی نہیں ہے '' وَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ جَعَلۡنَا بَيۡنَكَ وَبَيۡنَ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسۡتُوۡرًا ۝۴۵ ''[2] یعنی اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے چھپانے والا حجاب قرار دے دیتے ہیں سوال میں جو آیت ہے اس کی تفسیر میں مفسروں نے لفظ'' محجوب'' کی تفسیر محروم سے کی ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی رحمت ؛ کرامت ؛احسان ؛ اور قرب الٰہی سے محروم ہو جاتے ہیں [4]۔ پس اس میں مادی معنی مراد نہیں لئے گئے ہیں۔

سرانجام اس آیت کا ترجمہ یہ ہے'' ایسا نہیں ہے (جیسا کہ سمجھتے ہو) وہ لوگ اس

روز اپنے پرور دگار (کے رحم و کرم) سے مجوب و محرم ہوں گے“ [5]

حواشی

[2] اسراء ۴۵

[4] طبرسی فصل بن حسن مجمع البیان فی تفسیر القرآن۔ج ۱۰ ’ص ۶۷۹۔ ناصر خسرو؛ تھران ۱۳۷۳ ش: حسینی ہمدانی، سیّد محمّد حسین۔ انوار درخشان ’ ج۱۸ ص ۴۴ بیشتر کتابفروشی لطفی؛ تھران؛ چاپ؛ اول ۱۴۰۴ ق؛ مکارم شیرازی ناصر؛ تفسیر نمونہ؛ ج ۲۶؛ ص ۲۶۳؛ دار الکتب الاسلامیۃ؛ تھران؛ ج اول؛ ۱۳۷۴ ش

[5] مطففین ؛ ۱۵؛

کیا وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ ...“ امام علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو صیغہ جمع کے، ایک فرد کے لئے استعمال ہونے کی کیسے توجیہ کی جا سکتی ہے؟

کیا آیہ شریفہ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ ... امام علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے؟ چنانچہ زرارہ نے امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا ہے کہ، اگر ایسا ہے تو صیغہ جمع کے ایک فرد کے لئے استعمال ہونے کی کیسے توجیہ کی جا سکتی ہے؟ اس آیہ شریفہ سے چشم پوشی کرتے ہوئے، کیا تاریخی واقعات اس مطلب کو ثابت کرتے ہیں کہ مردوں میں حضرت علی بن ابیطالبؑ اولین شخص تھے جو رسول خدا (ص) پر ایمان لائے؟ یا کسی اور کو یہ فخر حاصل ہوا ہے؟

مختصر جواب

آیہ شریفہ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ ... امام علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے یا نہ ہوئی ہو، آپؑ کے پہلے مسلمان ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا ہے، کیونکہ بصورت اجماع ثابت ہوا ہے کہ رسول خدا (ص) پر ایمان لانے والی عورتوں میں

سے پہلی عورت، آنحضرت (ص) کی وفادار شریک حیات حضرت خدیجہؓ تھیں اور تمام علمائے شیعہ اور بہت سے سنی علماء کے بقول مردوں میں سے آنحضرت (ص) پر لبیک کہنے والے پہلے شخص حضرت علیؑ تھے۔ اس لحاظ سے علیؑ اولین شخص ہیں جو اس آیہ شریفہ کے مصداق ہیں اور اس آیت کو آپؑ پر تطبیق کیا جاتا ہے۔

لیکن لفظ السابقون کے صیغہ جمع سے مفرد کا ارادہ کرنے کے بارے میں اعتراض کے جواب میں کہنا چاہئے کہ: اس قسم کا استعمال کوئی نئی چیز نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید، عربی ادبیات اور دوسری زبانوں میں بھی اس قسم کا استعمال بکثرت ملتا ہے کہ لفظ جمع استعمال ہوتا ہے اور اس سے ایک فرد مراد لیتے ہیں۔ ہم تفصیلی جواب میں اس کی چند مثالوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

تفصیلی جواب

آیہ شریفہ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ... کی تفسیر میں جانے اور اس کی شان نزول بیان کرنے سے پہلے دو نکتوں کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے:

۱۔ اس آیہ شریفہ اور دوسری آیات کو مدنظر رکھے بغیر کہ کیا امامؑ پیغمبر اسلام (ص) پر ایمان لانے والے پہلے شخص تھے۔ بہ الفاظ دیگر، کیا تاریخی واقعات ثابت کرتے ہیں کہ رسول خدا (ص) پر ایمان لانے والے مردوں میں امام علیؑ پہلے شخص تھے؟؛

۲۔ فرض کریں کہ آیہ شریفہ **السابقون الاولون**۔ کسی خاص شخص کی شان میں نازل نہیں ہوا ہے، لیکن کیا جری اور تطبیق کے لحاظ سے ۔۔۔۔۔ نہ کہ حصر سبب نزول کے لحاظ سے ۔۔۔ اس آیت کو حضرت علیؑ سے تطبیق کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟؛

پہلا نکتہ:

پہلے نکتہ کے بارے میں یہ قابل ذکر ہے کہ ہر شخص جو تفسیر، حدیث اور سیرت

(معصومینؑ کی زندگی کی تاریخ) کی کتابوں کی طرف رجوع کرے، اسے واضح طور پر معلوم ہوگا کہ، اسلام میں پہلے ایمان لانے والوں کی داستان، خاص کر مذکورہ آیہ شریفہ کی بحث کے بارے میں، اس قدر خاص مقام ومنزلت کی حامل ہے کہ اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

سوال کے پہلے حصہ،یعنی کیا علی بن ابیطالبؑ پہلے مرد مسلمان تھے؟ کے جواب میں قابل بیان ہے کہ: اہل سنت اور شیعہ مورخین بصورت اجماع اعتقاد رکھتے ہیں کہ رسول خدا(ص) پر ایمان لانے والی عورتوں میں پہلی عورت، آنحضرت (ص) کی وفادار شریک حیات حضرت خدیجہؑ تھیں اور تمام علمائے شیعہ اورسنی علماء کی ایک بڑی تعداد کا اعتقاد ہے کہ مردوں میں سے آنحضرت (ص) کی دعوت اسلام پرسب سے پہلے لبیک کہنے والے حضرت علی بن ابیطالبؑ تھے[1]۔

البتہ،بعض لوگوں نے امام علیؑ کی اس فضیلت اور خصوصیت،یعنی اسلام قبول کرنے میں سبقت کو دوسروں سے نسبت دی ہے؛ اور اس کے لئے یہ بہانہ لائے ہیں کہ حضرت علیؑ اس زمانہ میں نوجوانی کی عمر میں تھے۔ ہمارے لئے یہاں پر اس تنگ نظری کے بارے میں تنقید کرنے کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ یہ اہم مسئلہ روایات سے ثابت ہو چکا ہے،اس لئے ہم یہاں پر اس سلسلہ میں چند روایات کومثال کے طور پر پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔اس موضوع کے بارے میں تاریخ طبری میں آیا ہے کہ: گزشتہ لوگوں نے، حضرت خدیجہ کے بعد رسول خدا(ص) پر سب سے پہلے ایمان لانے والے شخص کے بارے میں اختلاف کیا ہے،بعض کہتے ہیں کہ سب سے پہلے مرد جو پیغمبراکرم(ص) پر ایمان لائے اور آپ(ص) کے پیچھے نماز پڑھی، علی بن ابیطالبؑ تھے۔ اس کے بعد طبری کہتے ہیں: ابن حمید کہتا ہے: ابراہیمؑ بن مختار نے شعبہ سے اور اس نے ابی بلج سے اور اس نے

عمرو بن میمون سے اور اس نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے شخص، جنہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی علی تھے۔[2]

اس کے علاوہ طبری نے جابر سے نقل کیا ہے کہ: پیغمبر اکرم (ص) سوموار کے دن رسالت پر مبعوث ہوئے اور علیؑ نے منگل کے دن نماز پڑھی[3]۔

وہ زید بن ارقم سے نقل کرتے ہیں: سب سے پہلے شخص، جو پیغمبر اکرم (ص) پر ایمان لائے، علی تھے۔[4]

۲۔ ابن اثیر، زید بن ارقم سے نقل کرتے ہیں کہ: سب سے پہلے شخص جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے، علی تھے۔ اس کے علاوہ عفیف کندی کہتے ہیں: میں تجارت کے سفر پر تھا، اس دوران، مکہ پہنچا، یہ حج کے ایام تھے۔ میں نے عباس کو دیکھا، اور اسی دوران دیکھا کہ ایک شخص نے آکر کعبہ کے پاس نماز پڑھی، اس کے بعد ایک خاتون آگئیں اور ان کی اقتداء کی، ان کے بعد ایک نوجوان لڑکا آیا اور ان کے ساتھ نماز پڑھی۔ اس کے بعد میں نے پوچھا: اے عباس؛ یہ کونسا دین ہے؟ عباس نے جواب میں کہا: یہ مرد محمد بن عبداللہ، میرا بھتیجا ہے اور وہ خاتون ان کی شریک حیات اور وہ نوجوان علی بن ابیطالب ہیں، جو ان پر ایمان لائے ہیں، اس کے بعد کہا: خدا کی قسم زمین پر ان تین افراد کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے کہ یہ دین کیا ہے۔ عفیف نے کہا: کاش؛ میں ان میں چوتھا ہوتا؛[5]

۳۔ احمد بن حنبل کہتے ہیں: وکیع نے شعبہ سے، اور اس نے عمرو بن مرہ سے، اور اس نے انصار کے ہم پیمان ابی حمزہ سے اور اس نے زید بن ارقم سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا: سب سے پہلے شخص جو رسول خدا (ص) پر ایمان لائے، وہ علیؑ تھے۔[6]

۴۔ ترمذی اپنی سنن میں لکھتے ہیں: میں نے سنا ہے کہ زید بن ارقم کہتے تھے کہ سب سے پہلے شخص جو اسلام لائے، علی تھے۔[7]

۵۔ ابن سعد، کتاب طبقات میں لکھتے ہیں: وکیع بن حراج، یزید بن ہارون، اور عفان بن مسلم نے شعبہ سے اور اس نے ابوحمزہ سے، اس نے زید بن ارقم سے مجھے خبر دی ہے کہ جو شخص سب سے پہلے رسول خدا (ص) پر ایمان لائے، وہ علی تھے۔[8]

یہ مسئلہ، علمائے اہل سنت کے درمیان اس قدر مشہور ہوا کہ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ اس پر اتفاق نظر رکھتے ہیں، من جملہ حاکم نیشا پوری نے مستدرک صحیحین اور کتاب المعرفہ میں اس مطلب کو قرطبی سے نقل کر کے یوں بیان کیا ہے:

مورخین کے درمیان علی بن ابیطالب کے پہلے مسلمان ہونے پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جس چیز پر اختلاف ہے، وہ یہ ہے کہ کیا ان کا ایمان لانا ان کے بلوغ کے زمانہ میں تھا یا نہیں۔[9]

ابن عبدالبر اپنی کتاب استیعاب میں لکھتے ہیں: اس مسئلہ پر اجماع اور اس پر اتفاق ہے کہ سب سے پہلے جو لوگ رسول خدا (ص) پر ایمان لائے خدیجہ اور ان کے بعد علی تھے۔[10]

ابوجعفر اسکافی کہتے ہیں: تمام لوگوں نے، علی کے اسلام لانے میں سبقت پر فخر و مباہات کی روایت کی ہے۔[11]

جو کچھ یہاں تک بیان کیا گیا وہ اہل سنت کی احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں سے تھا۔ لیکن شیعوں کے منابع کے بارے میں ہم اس موضوع پر صرف صاحب تفسیر البرہان کی نقل کی گئی روایتوں کی ایک جھلک پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ معاویہ سے صلح کرنے کے بعد امام حسنؑ کے خطبہ میں آیا ہے: میرے باپ پہلے شخص تھے جنہوں نے خداوندمتعال اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت قبول کی اور وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ایمان لا کر خدا اور اس کے رسول (ص) کی تصدیق کی۔[12]

ابن شہر آشوب مازندرانی کہتے ہیں: لیکن اسلام لانے میں علیؑ کی سبقت سے متعلق روایتوں پر کتابیں تالیف کی گئی ہیں۔[13]

۲۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: آیہ شریفہ **السابقون الاولون۔۔۔** علیؑ اور مہاجر و انصار میں سے ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے، جنہوں نے رسول خدا(ص) کی پیروی کی ہے اور ان کے لئے ایسی بہشت مہیا کی گئی ہے، جس میں نہریں جاری ہیں اور وہ اس میں ابد تک رہیں گے، یہ وہی **فوز عظیم** ہے۔[14]

یہاں پر ہم اسی پر اکتفا کرتے اور کہتے ہیں کہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے کہ امام علیؑ بحق پہلے شخص ہیں جو رسول خدا(ص) پر ایمان لائے ہیں۔

لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول خدا(ص) پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ابوبکر تھے، ان کے دلائل کو شیعہ علما نے مسترد کیا ہے، من جملہ جن علماء نے ان دلائل کو مسترد کردیا ہے، صاحب تفسیر نمونہ ہیں، وہ اس سلسلہ میں یوں لکھتے ہیں: دلچسپ بات ہے کہ جو لوگ حضرت علیؑ کے ایمان لانے میں سبقت کا انکار نہیں کر سکے ہیں، وہ کئی وجوہات کی بنا پر کوشش کرتے ہیں کہ ایک اور صورت میں اس سے انکار کریں یا اس مسئلہ کی اہمیت کو گھٹا دیں، اور بعض دوسرے افراد ان کی جگہ پر ابوبکر کو سب سے پہلا مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بعض اوقات کہتے ہیں کہ علیؑ اس وقت دس سال کے تھے اور قدرتی طور پر نابالغ تھے، اس بنا پر ان کا، ایک نوجوان لڑکے کی حیثیت سے اسلام لانا دشمنوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے محاذ کو کسی قسم کی طاقت نہیں بخش سکتا تھا[15]۔ اور یہ بیشک تعجب کی بات ہے، کیونکہ اولاً: یہ پیغمبر اکرم(ص) کی ذات پر اعتراض ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں، کہ **یوم الدار** کے موقع پر جب پیغمبر اسلام نے دین اسلام کو اپنے خویش و اقارب کے سامنے پیش

کیا، تو حضرت علیؑ کے علاوہ کسی اور نے اسے قبول نہیں کیا اور یہ صرف علیؑ تھے جنہوں نے کھڑے ہو کر اسلام کا اعلان کیا۔ پیغمبر اکرم (ص) نے ان کے اسلام لانے کو قبول کیا اور حتی کہ اعلان کیا کہ: تم میرے بھائی، وصی اور جانشین ہو؛

ثانیاً: جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ اس دن حضرت علیؑ کی کم عمری کسی صورت میں مسئلہ کی اہمیت کو نہیں گھٹاتی ہے، خاص کر یہ کہ قرآن مجید حضرت یحییٰؑ کے بارے میں صراحتاً ارشاد فرماتا ہے: وآتیناہ الحکم صبیاً۔۔[16] ہم نے اسے بچپن میں ہی حکم دیا ہے۔ اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بھی پڑھتے ہیں کہ انہوں نے نوزاد بچے کی حالت میں گفتگو کی اور ان کے بارے میں شک وشبہ سے دوچار ہوئے افراد سے مخاطب ہو کر فرمایا: إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا[17]۔ میں خدا کا بندہ ہوں، مجھے آسمانی کتاب عطا کی گئی ہے اور مجھے پیغمبر قرار دیا گیا ہے۔

ثالثاً: تاریخی لحاظ سے یہ موضوع مسلم اور صحیح نہیں ہے کہ ابوبکر اسلام لانے والے تیسرے شخص ہیں، بلکہ اسلام کی بہت سی تاریخی اور احادیث کی کتابوں میں ان سے پہلے ایک گروہ کے اسلام لانے کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ابن ابی الحدید، اہل سنت کے مشہور عالم ابوجعفر اسکافی (معتزلی) سے نقل کرتے ہیں کہ بعض کہتے ہیں: ابوبکر اسلام لانے میں سبقت رکھتے ہیں، اگر یہ صحیح ہو، تو انہوں نے خود کسی موقع پر اس موضوع کے سلسلہ میں اپنی فضیلت کا استدلال کیوں نہیں کیا؟ اس کے علاوہ صحابیوں میں ان کے حامیوں میں سے کسی ایک نے بھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔[18]

صاحب شرح کشف المراد نے بھی اس شبہ کا یوں جواب دیا ہے کہ:

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ علی بن ابیطالبؑ بالغ ہونے سے پہلے اسلام

لائے ہیں اوراس قسم کا اسلام قابل قبول نہیں ہے،تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ:

۱۔شہادت کے وقت حضرت علیؑ کی عمر ۶۵ یا ۶۶ سال تھی، جبکہ پیغمبراسلام(ص) نے رسالت پر مبعوث ہونے کے بعد ۲۳ سال زندگی گزاری ہے اور پیغمبر(ص) کی رحلت کے بعد علی ۳۰ سال زندہ رہے،نتیجہ کے طور پر پیغمبراکرم(ص) کی بعثت کے وقت علیؑ کی عمر ۱۲ سے ۱۳ سال تھی اوراس عمر میں بالغ ہونا ممکن ہے۔ پس علیؑ پیغمبر(ص) کے اس ارشاد کے مصداق ہیں کہ حضرت زہراؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا: میں نے تجھے ایک ایسے شخص کے ازدواج میں قرار دیا ہے کہ اسلام میں سبقت لینے والے اور مردوں میں سے عالم ترین شخص ہیں۔[19]

۲۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچے عقل اور عقل کی بالیدگی کے لحاظ سے مکمل ہوتے ہیں اور جسمانی بلوغ سے پہلے فکری طور بالغ ہوتے ہیں، اس صورت میں ان پر تکلیف شرعی عائد ہوتی ہے، اس لحاظ سے ابوحنیفہ بچوں کے اسلام کے صحیح ہونے کا حکم دیتے ہیں، اگر ایسا ہوتو یہ حکم بچہ کے کمال و بلوغ پر دلالت کرتا ہے۔

اس مسئلہ میں چند نکتے قابل توجہ ہیں:

اولاً: بچوں کی فطرت اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کی طرف میلان، کشش اور محبت رکھتے ہیں، اس صورت میں اگر کوئی بچہ اپنے ماں باپ سے منہ پھیر کر خداوندمتعال کی طرف جذب ہو جائے،تو یہ اس بچے کی فکری بالیدگی اور کمال کی نشانی ہے۔

ثانیاً: بچوں کی جبلت،عقل اور تکالیف الٰہی کے امور کے ساتھ کوئی خاص نسبت نہیں رکھتی ہے، بلکہ ان کی جبلت سرگرمی اور کھیل کود کے متناسب ہوتی ہے۔اس لحاظ سے ان کا اس چیز سے منہ موڑنا جوان کی فطرت کے مطابق ہے اور ایسی چیز کی طرف میلان اور کشش رکھنا جوان کی فطرت کے خلاف ہو، بذات خود بچوں کے کمال کی علامت ہے، اور یہ

علیؑ کے ایمان میں پیش قدم ہونے کی دلیل ہے[20]۔

دوسرا نکتہ:

اگر ہم یہ قبول کریں کہ آیہ شریفہ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ... حضرت علیؑ کی شان میں نازل نہیں ہوئی ہے، کیونکہ مفسرین نے اس آیہ شریفہ کے لئے کئی شان نزول بیان کیے ہیں، لیکن شان نزول کا یہ تعدد اس کے واضح ترین مصداق یعنی امام علیؑ سے مطابق کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا ہے۔ خاص کر احمد ابن حنبل کے ابن عباس سے نقل اور سیوطی کے الدار المنشور میں ابو نعیم کے ابن عباس سے نقل کے مطابق کہ پیغمبر اکرم (ص) نے فرمایا: کوئی آیت نہیں نازل ہوئی ہے، جس میں یا ایھا الذین آمنوا ہو، مگر یہ کہ علی اس آیت کے سرفہرست اور ان کے امیر ہوں گے۔[21]

لیکن لفظ جمع استعمال کر کے اس سے مفرد کا ارادہ کرنے کے بارے میں کہنا یہ ہے کہ:

اولاً: اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت امام علیؑ کی شان میں نازل نہیں ہوئی ہے، بلکہ اسلام میں ان کی سبقت کے پیش نظر جری اور حضرت پر تطبیق کے لحاظ سے، اس کی آپؑ سے تطبیق کی گئی ہے، تو پھر اس اعتراض کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔

ثانیاً: حتی کہ اگر ہم معتقد ہو جائیں کہ آیت حضرتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے، پھر بھی اس اعتقاد پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا ہے، اس لئے کہ:

۱۔ متعدد دلائل موجود ہونے کی وجہ سے یہ ناممکن نہیں ہے۔

۲۔ یہ استعمال، یعنی جمع کا صیغہ، ایک یا دو افراد کے لئے استعمال ہونا، کوئی تازہ چیز نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید، روایات اور عربی ادبیات اور دوسری زبانوں میں بھی یہ بکثرت استعمال ہوا ہے، یعنی لفظ جمع لایا گیا ہے اور اس سے ایک فرد کا ارادہ کیا گیا ہے، مثال کے طور

پر قرآن مجید میں آیا ہے:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ...[22] اور جو کچھ بھی اسلام و کفر کے لشکر کے مقابلہ کے دن تم لوگوں کو تکلیف پہنچی ہے وہ خدا کے علم میں ہے۔

آیہ شریفہ میں مفسرین کے مطابق ناس سے مراد نعیم ابن مسعود ہے، کیونکہ یہ وہی تھا جس نے مسلمانوں کو کفار کی بڑی جمعیت سے ڈرانے کے لئے ابوسفیان سے مال حاصل کیا تھا۔ اسی طرح ہم دوسری آیت میں پڑھتے ہیں کہ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ○...؛[23] اللہ نے ان کی بات کو بھی سن لیا ہے جن کا کہنا ہے کہ خدا فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں۔۔۔

اس آیت میں بھی بہت سے مفسرین کے مطابق الذین سے مراد حی بن اخطب یا فنصاص ہے۔

کبھی احترام، تعظیم و تکریم کے لحاظ سے بھی ایک شخص کے لئے لفظ جمع استعمال ہوتا ہے، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں آیا ہے۔ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا [24] ابراہیمؑ (اکیلے ہی) خدا کے مطیع اور فرمانبردار ایک امت تھے۔ اس آیت میں امت کا لفظ جو اسم جمع ہے، حضرت ابراہیمؑ کے لئے استعمال ہوا ہے[25]۔ اس کے علاوہ خداوندمتعال فرماتا ہے: يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ [26] یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ واپس آ گئے تو ہم صاحبان عزت ان ذلیل افراد کو نکال باہر کریں گے حالانکہ ساری عزت، اللہ، رسول اور صاحبان ایمان کے لئے ہے۔ لیکن منافقین نہیں جانتے ہیں۔

یہاں پر بھی یقولون (جو یہ کہتے ہیں) جمع ہے، مفسرین کے اجماع کے مطابق، مراد ابن ابی نام کا ایک منافق ہے۔

قرآن مجید میں ایسی آیات کثرت سے ملتی ہے جن میں صیغہ جمع استعمال کیا گیا ہو اور مراد ایک فرد ہو[27]۔ یہاں پر ان تمام آیات کی طرف اشارہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

حواشی

[1] مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج8، ص103، دار الکتب الاسلامیہ، تہران، طبع اول، 1374ھ ش.

[2] طبری، ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ الأمم والملوک معروف بہ تاریخ طبری، ج2، ص310، تحقیق، محمد ابوالفضل ابراہیم، بیروت، دار التراث، طبع دوم، 1387۔1967.

[3] ایضاً.

[4] ایضاً.

[5] ابن اثیر، عزالدین ابوالحسن، الکامل فی التاریخ، ج2، ص57، بیروت، دار صادر، 1385۔1965.

[6] احمد بن حنبل، مسند، ح18478، نقل از نرم افزار المکتبۃ الشاملۃ.

[7] ترمذی، سنن، ح4100، نقل از نرم افزار المکتبۃ الشاملۃ.

[8] ابن سعد، محمد بن سعد بن منیع الہاشمی البصری، الطبقات الکبری، ج3، ص15، تحقیق، محمد عبد القادر عطا، باب (ذکر اسلام علی وصلاتہ)، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، طبع اول، 1410۔1990.

[9] قرطبی، محمد بن أحمد، الجامع لاحکام القرآن، ج8، ص235، ناصر خسرو، تہران، طبع اول، 1406ق.

[10] ابن عبد البر، أبوعمر یوسف بن عبد اللہ، الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب، ج3، ص1092، تحقیق، علی محمد البجاوی، بیروت، دار الجیل، طبع اول، 1412۔1992.

[11] تفسیر نمونہ، ج8، ص104.

[12] بحرانی، سید ہاشم، البرہان فی تفسیر القرآن، ج2، ص829، مؤسسہ بعثت، تہران، طبع اول، 1416 ہ.

[13] ایضاً، 833

[14] ایضاً.

[15] اس بات کو فخر رازی نے آیت کی تفسیر کے ذیل میں بیان کیا ہے

[16] مریم، 12.

[17] مریم، 30.

[18] تفسیر نمونہ، ج 8، ص 100 ۔ 107 (خلاصہ).

[19] ذہبی، تاریخ الاسلام، تحقیق، عمر عبد السلام، ج 3، ص 638، دارالکتاب العربی، بیروت، طبع دوم، 1413۔1993.

[20] سبحانی، جعفر، شرح کشف المراد، ص 223، بلا تاریخ.

[21] جلال الدین، سیوطی، الدر المنثور فی تفسیر المأثور، ج 1، ص 104، کتابخانہ آیت اللہ مرعشی نجفی، قم؛ بلاغی نجفی، محمد جواد، آلاء الرحمن فی تفسیر القرآن، ج 1، ص 11، موسسہ بعثت، طبع اول، قم، 1420ھ.

[22] آل عمران، 173.

[23] آل عمران، 181.

[24] نحل، 120.

[25] تفسیر نمونہ، ج 2، ص 588.

[26] منافقون، 8.

[27] ملاحظہ ہو: سید محمد الکاظمی القزوینی، الردّ علی ردّ السّقیفة، ج 1، ص 269، تصحیح و تعلیق، ہیئت محمّد امین، مکتبة ومرکز الأمین، قم، طبع دوم 2002ء.

کیوں قرآن کی بعض آیتیں انبیاء کی عصمت کے منافی ہیں؟ براہ کرم واضح کیجئے۔

مختصر جواب

اس سوال کے جواب میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ:

1۔ عصمت، معصوم فرد کے نفس کی ایک خاص بالیدہ حالت کو کہتے ہیں جس کی بنا پر وہ گناہوں، لغزشوں سے دور بلکہ ہر قسم کے خطا، نسیان، بھول، چوک سے بھی محفوظ رہتا ہے؛ بغیر یہ کہ اس سے اس کا اختیار چھن جائے؛ یا معصوم پر کسی قسم کا دباؤ یا جبر حاکم ہو۔

2۔ انبیاء کی عصمت کا راز، شہودحق کی منزل پر فائز ان کے علم کامل، گہرے ایمان و عقیدے، خداوند عالم سے وہ الہانہ عشق ومحبت، حق تعالیٰ کی عظمت کے احساس، اور اس کے صفات جمال وجلال کے عرفان میں پوشیدہ ہے۔ اس کے علاوہ خداوند عالم کی تائید اور توفیق، انبیاء کو شیاطین کے شر سے نیز نفسانی خواہشات کی اتباع سے محفوظ رہنے میں مزید تقویت دیتی ہے۔

3۔ انبیاء کی عصمت کی ضرورت، اور انہیں لازمی طور سے معصوم ہونے کے سلسلہ میں عقلی دلائل بھی بہت ہیں؛ منجملہ یہ کہ ان کے معصوم نہ ہونے سے نقض غرض پیش آتا ہے اور تحصیل غرض کا لازمہ عصمت ہے۔

4۔ اگر قرآن کریم کی بعض آیتیں عقلی دلائل کے خلاف نظر آ رہی ہوں، تو آیات کے مفاد میں غور وفکر کر کے، نیز دوسری آیتوں اور روایتوں کو بھی مدّنظر رکھ کے، اس کے صحیح معنی کو حاصل کرنا چاہیے؛ اور بادی النّظر میں آنے والے اس کے سطحی معنی کو صحیح انداز سے سمجھنا چاہیے۔

5۔ انبیاء کے لئے عصمت کی ضرورت اور اس کے لازمی ہونے پر قرآن کریم کی بہت سی آیتیں بھی دلالت کرتی ہیں؛ اگر چہ ان میں عصمت لفظ استعمال نہیں ہوا ہے؛ مثال کے طور پر:

الف: قرآن کی بہت سی آیتوں میں انبیاء کو مخلَص بتایا گیا ہے: جیسے سورہ صٓ کی 45 سے 48 آیتوں میں؛ اور مخلَص اسے کہتے ہیں جس پر شیطان کی گمراہیوں کا سایہ بھی نہ پڑے۔

ب: انبیاء، خاص الٰہی ہدایت سے بہرہ مند ہیں؛ اس سلسلہ میں بھی بے شمار آیتیں موجود ہیں، مثال کے طور پر سورہ انعام کی 84 سے 90 تک کی آیتیں؛ ظاہر سی بات ہے خداوند عالم کی خاص ہدایت جس کے شامل حال ہو، اس کے سلسلہ میں خطا، لغزش، گمراہی وغیرہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ج: خداوند عالم نے بہت سی آیتوں میں انبیاء کی پیروی اور ان کی تبعیت کا حکم دیا ہے اور لوگوں کو ان کی بے قید وشرط اطاعت پر مامور کیا ہے۔ مثال کے طور پر سورہ آل عمران کی 31 اور 32 آیتوں میں؛ یا سورہ نساء کی آیت نمبر 80 میں؛ یا سورہ نور کی آیت نمبر 52 میں؛ ظاہر سی بات ہے کسی کی بے قید وشرط اطاعت کا لازمہ یہ ہے کہ وہ معصوم ہو، اور عصمت اس میں لازمی طور سے پائی جاتی ہو۔

د: سورہ جن کی 26 سے 28 تک کی آیتیں، خداوند عالم کی جانب سے انبیاء کی ہر

طرف، ہر جانب سے حفاظت پر دلالت کرتی ہے۔

ھ: آیہ تطہیر (احزاب 32) رسول خدا صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی عصمت پر روشن اور واضح دلیل ہے۔

6۔ وہ آیتیں جو ظاہراً مقام عصمت کے منافی ہیں ؛ یا تو وہ جملہ شرطیہ ہیں جو کہ معصیت کے واقع ہونے پر دلالت نہیں کرتیں ؛ یا تو اس کے اصلی مخاطب عام مؤمنین ہیں نہ کہ انبیاء۔

7۔ عام طور سے حضرت آدم کے عصیان کے سلسلہ میں سب سے زیادہ شبہات وارد ہوتے ہیں ؛ اس کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے۔

1۔ آیات میں مذکورہ نہی ارشادی تھی نہ کہ مولوی۔

2۔ نہی مولوی کی صورت میں بھی، نہی تحریمی نہیں تھی جو کہ گناہ شمار ہو، بلکہ صرف ترک اولی تھا۔

3۔ وہ عالم، عالم فرائض، واجبات ومحرمات نہیں تھا کہ اس کی مخالفت عصیان ہو۔

8۔ اگر خداوند عالم نے بعض مقام پر انبیاء عظام سے سختی کے ساتھ خطاب کیا ہے ؛ تو اس لئے کہ بہر حال وہ بھی انسان ہیں ؛ ان کے اندر بھی وہ تمام انسانی اور نفسانی خواہشات پائی جاتی ہیں جو ایک عام انسان میں ہوتی ہیں ؛ لہٰذا وہ بھی الٰہی نصیحتوں، رہنمائیوں کے محتاج ہیں کہ اگر ایک لمحے بھی خود ان پر چھوڑ دیا جائے تو ہلاک ہو جائیں گے۔

مفسرین کرام نے کلمہ "واضربوهن"(عورتوں کو مارو) کوآیہ نشوز میں کس طرح تفسیر کرتے ہیں اوراسکی کیا وجہ بتاتے ہیں؟

مختصر جواب

اسلامی تعلیمات کے مطابق، عورتیں ایک اہم مقام کی حامل ہیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی روایات میں ان کی تعریف اور تمجید کی گئی ہے، ہماری روایات میں صالح عورتیں خیر اور برکت کے سرچشمے اور کسی بھی دنیاوی گوہر سے زیادہ قیمتی جانی جاتی ہیں۔ اس طرح اسلام نے عورتوں کی تنبیہ سے منع کیا ہے، اور جو مرد اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ سب سے برا آدمی جانا گیا ہے۔

صرف ایک جگہ استثناء ہے جو عورتیں اپنے شوہروں کے حقوق کی طرف توجہ نہیں کرتی ہیں انکی ہدایت کیلئے دوسرے اقدامات اثر نہ کریں تو ان کو مارنے کی اجازت ہے۔ سورہ نساء کی آیہ شریفہ ۳۴ میں ان ہی عورتوں کی جانب اشارہ ہے۔

اس آیہ شریفہ کی ابتدا میں صالح ومطیع عورتوں کی صفات بیان کی گئی ہیں اس کے بعد خداوند متعال ان عورتوں (جو ممکن ہے ناشزہ اور غیر مطیع ہو) کے شوہروں کیلئے، احکام اور

فرائض بیان فرماتا ہے، پہلے مرحلے میں ان عورتوں کو نصیحت کرنا ہے دوسرے مرحلے میں ان کو خواب گاہ سے الگ کرنا جو پہلے کی بہ نسبت زیادہ شدید ہے پھر تیسرے مرحلے میں انہیں مار پیٹ کی اجازت دی گئی ہے اس سلسلے میں کچھ نکات کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے:

۱۔ یہ مرحلہ سب سے آخری مرحلہ ہے اور یہ واضح بات ہے کہ جب پہلے والے مرحلے نتیجہ دیں گے تو اس مرحلے تک نوبت نہیں آئے گی۔

۲۔ بدنی تنبیہ (مار پیٹ) کتب فقہی کے مطابق، ملائم اور بہت کم ہونی چاہئے اور یہ ہڈی کے ٹوٹنے، بدن کے زخمی ہونے اور بدن میں نیلا داغ ہونے کا سبب نہ بنے۔

۳۔ بدنی تنبیہ کے بھی مختلف درجے ہیں حتی کہ روایات میں مسواک کی لکڑی کی طرف اشارہ ہوا ہے پس جس صورت میں پہلا والا درجہ مؤثر ہے دوسرے درجے کی نوبت نہیں آتی ہے۔

۴۔ یہ مسئلہ عورتوں کیلئے مخصوص نہیں ہے اور مردوں کے ناسازگار برتاؤ کے سلسلے میں حاکم شرع کی ذمہ داری ہے کہ مختلف طریقوں سے یا تنبیہ بدنی کے ذریعے مردوں کو بھی اپنے فرائض سے آشنا کرسکتا ہے۔

تفصیلی جواب

اس سے پہلے کہ آیہ نشوز میں مفسرین کرام کے نظریات کو کلمہ **و اضربوھن** (عورتوں کی مار پیٹ کرو) کے بارے میں بیان کریں۔ ضروری ہے کہ اسلام میں عورت کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا جائے۔ بلند اسلامی تعلیمات، عورتوں اور بیویوں کیلئے کافی اہمیت کی قائل ہیں اور اسلامی روایات میں بھی ان کی تعریف کی گئی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: سب سے خیر اور برکت عورتوں کے وجود میں رکھی گئی ہے۔ [1] عالمِ شیعہ کے چھٹے امام نے عورتوں کو دو حصوں نیک اور برے میں تقسیم کیا ہے، اور نیک عورتوں کے بارے

میں فرمایا ہے اس قسم کی عورتوں کی قیمت سونا، چاندی اور جواھرات سے بھی زیادہ ہے اور کوئی بھی گوہر ان کے برابر اہمیت نہیں رکھتا ہے۔[2]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا ہے: یہ دنیا ایک مال کے مانند ہے اور اس دنیا کا بہترین مال نیک سیرت عورتیں ہیں[3]

معصومین علیہم السلام کے یہ قیمتی فرمودات، عورتوں کی اہمیت کے بارے میں اشارہ کرتے ہیں کہ ان کا وجود خیر اور برکت کا سرچشمہ ہے اور ان کی معنوی اور وجودی اہمیت دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہے۔

عورت کو سزا دینا منع ہے۔

اس سلسلے میں اسلامی قوانین ہمیں لطیف نکات کی طرف متوجہ کرتے ہیں کیونکہ عورتوں کی بدنی سزا اور روحانی آزار کو گھریلو جرم جانا گیا ہے بلکہ عورتیں بھی مردوں کے مانند عزیز اور شریف مخلوقات ہیں۔ پس انہیں مارنا انسان کیلئے قابل برداشت نہیں ہے، اور یہ دھڑکتے اور جذباتی دل شریف اور صنف نازک کے ہیں، ان کا بدن حیوانوں کے مانند نہیں ہے۔ جو مار پیٹ اور آزار کا تحمل کر سکے۔ اسی لئے اسلامی قوانین میں ان کو تکلیف دینا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اے لوگو! اپنی بیویوں کا خیال رکھو کیونکہ وہ الٰہی عہد کے ذریعے تمہارے اختیار میں قرار دی گئیں ہیں اور تم نے خدا کے مخصوص الفاظ کے ذریعے انہیں اپنے لئے حلال قرار دیا ہے کیا اس صورت میں اس خدائی امانت کی مار پیٹ یا انہیں زخمی کرنا صحیح ہے؟ اور ان کے دلوں کو جو عشق اور محبت کا مرکز ہے رنجیدہ مت کرو۔[4]

نیز فرماتے ہیں: برے مردوں کی علامتوں میں، ایک علامت یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی اور باندیوں کی مار پیٹ کرتے ہیں اور ان پر مہربانی اور رحم نہیں کرتے ہیں۔[5]

لیکن بعض عورتیں اپنے شوھروں کے حقوق کی طرف توجہ نہیں کرتی ہیں ان کی جنسی ضروریات کو پورا نہیں کرتی ہیں اور اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر آتی ہیں۔ اپنے برے اخلاق سے گھر کی محبت آمیز فضا کو آگ میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اور شوہر کی خصوصی زندگی میں ٹانگ اڑا کر اسے خراب کرتی ہیں۔ اسلامی نظریہ کے مطابق اس طرح کی عورتیں انسانی اہمیت کا فقداں رکھتی ہیں اور اسلام نے ان کی شدید مذمت کی ہے رسول اسلام ﷺ فرماتے ہیں: عالم خلقت میں سب سے بُری چیز (غیر موافق) بری عورتیں ہیں۔ [6]

قرآن اور احادیث میں، اسلامی فقہ کی نظر سے اس طرح کی عورتوں کو ناشزہ عورتیں کہتے ہیں، جس کی جڑ ان کا غرور اور خود پسندی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ خاص عورتیں شوہر کی پیروی نہیں کرتی ہیں اور اپنے خاوند کی زندگی کو کڑوا اور ناگوار بناتی ہیں، دین اسلام نے اس طرح کی عورتوں کی اصلاح کیلئے ایک عاقلانہ راہ نکالی ہے۔ قرآن مجید نے اس آیہ شریفہ میں آیہ نشوز، کہ جو سورہ نساء میں ہے لطیف اور دلچسپ نکات کو زناشوئی اور گھریلو مسائل کے بارے میں بیان کیا ہے اور خوش قسمتی سے جدید علوم نے ان روابط کے بعض اسرار کا انکشاف کر کے بیان کیا ہے۔ حقیقت میں یہ آیہ شریفہ قرآن کریم کے علمی (سائنسی) معجزات میں سے ایک ہے اگر چہ پورا قرآن مختلف لحاظ سے معجزہ ہے۔

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ گھریلو مسائل خصوصا میاں بیوی کے مسائل بہت لطیف اور ظریف ہیں کبھی کبھی محبت اور عشق کو غصہ کے ذریعے، اور کبھی غصہ کو محبت کے ذریعے دکھانا چاہئے۔ محبت اور غصہ کے حدود کو سمجھنا اور انکی رعایت کرنا، محبت ظاہر کرنے اور غصہ ظاہر کرنے کے مواقع کو پہچاننا آسان نہیں ہے۔

فلاسفہ اور ماہرین سماجیات، تربیت اور نفسانیات کے عالموں نے گزشتہ زمانوں

سے ان نکات کو سمجھنے کی کافی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں مختلف کتابیں تحریر کی ہیں، لیکن قرآنی آیات اور پیغمبر اور ائمہ معصومین علیہم السلام کا طرہ امتیاز یہ رہا ہے کہ انسانی ضروریات کے اہم اور ضروری نکات کے اصول اور قواعد کو سادہ مختصر، خوبصورت اور عام فہم زبان میں بیان کیا ہے جو ہر ایک کیلئے قابل عمل ہے۔

سورہ نساء کی آیہ شریفہ ۳۴ کے بارے میں بہت سے مطالب موجود ہیں۔ لیکن اختصار کے طور پر بعض کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے۔ یہ آیہ شریفہ گھر کی سرپرستی اور معیشت کی ذمہ داری مردوں کے شانوں پر رکھتی ہے اور عورتوں کو گھریلو کام کی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ پہلا گروہ صالح اور ہدایت یافتہ عورتوں کا ہے، جو گھریلو نظام کے بارے میں مخلص اور کار بند ہیں وہ نہ صرف شوہر کی موجودگی میں بلکہ اسکی عدم موجودگی میں بھی گھریلو نظام کو چلاتی ہیں۔ البتہ مردوں کو اس طرح کی عورتوں کا نہایت ہی احترام اور احسان مند ہونا چاہیئے۔

۲۔ دوسرا گروہ ان عورتوں پر مشتمل ہے جو اپنے فرائض سے سرکشی کرتی ہیں اور مخالفت کے آثار ان میں نمایاں ہوتے ہیں، قرآن مجید نے مردوں کے لئے اس طرح کی عورتوں کے بارے میں خاص ذمہ داریاں بیان کی ہیں جو درجہ بہ درجہ انجام پانی چاھئیں اور ہر صورت میں ہوشیار رہنا چاہیئے کہ عدل و انصاف کے حدود سے باہر نہ نکل جائیں یہ آیہ شریفہ ان فرائض کو اس طرح بیان کرتی ہے:

پہلا درجہ: جن عورتوں کی نافرمانی کا خطرہ ہے انہیں موعظہ کرو اس ترتیب سے جو عورتیں اپنی گھریلو حدود سے پاؤں زیادہ پھیلاتی ہیں۔ سب سے پہلے انہیں نصیحت کرنی چاہیئے اور انہیں اپنے کاموں کے برے نتائج سے آگاہ کرنا چاہیئے اور اپنی ذمہ داری کی

طرف توجہ دلانی چاہیئے، تاکہ وہ اس برے کام سے باز آجائیں۔

دوسرا مرحلہ: جب تمہاری نصیحتوں کا کوئی اثر نہ ہو تو ان کی خواب گاہ کو الگ کر دو، یہ ردعمل اور ان کی طرف توجہ نہ کرنا اور روٹھنا، اس بات کی دلیل ہے کہ مرد اپنی زوجہ کے کردار سے راضی نہیں اور شاید مرد کا یہی ردعمل عورت کی روح میں اثر کرے۔

تیسرا مرحلہ: واضربوھن انہیں مارو، اگر عورت کی نافرمانی حد سے گذر جائے اور گھر کا قانون توڑنے میں وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔ نہ اس پر نصیحتیں اثر کریں اور نہ بستر سے الگ ہونا اس میں تبدیلی لائے تو پھر سختی کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، یہاں پر اجازت دی گئی ہے کہ مار پیٹ کے ذریعے انہیں اپنے فرائض کے انجام دینے پر مجبور کرو۔

ممکن ہے کہ یہ سوال اٹھے کہ اسلام کس طرح مردوں کو یہ اجازت دیتا ہے کہ عورتوں کے بارے میں شدت عمل اور مار پیٹ کریں؟

اس کا جواب ان قرآنی آیات اور اسلامی روایات کے معنی سے روشن ہوتا ہے جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں اور جس کی وضاحت فقہی کتابوں توضیحات سے ہوتی ہے اور جنہیں نفسیاتی عالموں نے آج کل کے دور میں بیان کیا ہے، کیونکہ:

اولا: آیہ شریفہ سے بدنی تنبیہ کو ان عورتوں کے بارے میں بیان کیا ہے جو اپنے فرائض کو انجام نہیں دیتی ہیں اور دوسرا کوئی وسیلہ ان کیلئے مفید نہیں ہوا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو صرف اسلام میں بیان ہوئی ہے بلکہ دنیا کے سب قوانین میں ہے کہ صلح آمیز طریقے جب لوگوں کو اپنے فرائض انجام دینے میں مؤثر نہیں ہوتے تو زور زبردستی کا قدم اٹھایا جاتا ہے۔

ثانیا: جیسا کہ فقہی کتابوں میں آیا ہے تنبیہ بدنی اس صورت میں بھی تنبیہ ملائم اور آہستہ ہونی چاہیئے اس طرح کہ تنبیہ بدن کے زخمی ہونے، نیلا ہونے اور ہڈیوں کے ٹوٹنے کا

سبب نہ بن جائے۔

ثالثا: آج کل ماہرین نفسانیات کا یہ نظریہ ہے کہ بعض عورتوں میں ایک خاص حالت مازونیزم (آزارطلبی) کے نام سے ہوتی ہے، اگران کے اندر یہ حالت شدید ہوجائے اوران کے سکون پانے کا طریقہ صرف بدنی تنبیہ ہوتوممکن ہے کہ آیہ شریفہ کا یہ حصہ ان خاص عورتوں کیلئے ہی ہو۔جن کے بارے میں مختصر بدنی تنبیہ آرام ہونے کا سبب بنے، اور یہ ایک ذہنی علاج ہے اور اسلام نے چاہا ہو کہ نصیحت اور روٹھنے اور مختصر مار پیٹ کے ذریعے اس طرح کے بیماروں کا علاج کرے، نہ کہ جدائی کا حکم دے کر انکی بیماری کو شدید کرے، اور انہیں انکے فرزندوں کو محبت کی نعمت اور گھر کو خوشگوار ماحول (جو کہ سماج کی اصلی بنیاد ہے)، سے محروم کرے۔

یہ بات یقینی ہے کہ اگر ان مراحل میں ایک مرحلہ موثر واقع ہوجائے اورعورت اپنے فرض کو پورا کرے، تو مرد کو کبھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مختلف بہانوں سے عورت کو ستائے اسی لئے آیت کے آخر میں یہ جملہ بیان ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے اطاعت کی تو انہیں مت ستاؤ۔

مرکز توجہ یہ نکتہ یہ ہے کہ تنبیہ بدنی کی آخر حد، زخمی اور بدن کا نیلا نہ ہونا نیز ہڈیوں کا نہ ٹوٹنا قرار دیا گیا ہے لیکن چونکہ مار پیٹ کا مقصد عورت کو اطاعت شعار بنانا اور روگردانی کی حالت کو ختم کرنا ہے، اس لئے بدنی تنبیہ کے سلسلے میں مراتب کی رعایت کرنا ضروری ہے، اور اگر مقصد خفیف مرتبے ہی سے حاصل ہوتا ہے تو شدت اور سختی کے مرحلے تک پہنچنا جائز نہیں، اور شاید ان روایات سے مراد جن میں مار پیٹ سے مراد، مسواک کی لکڑی سے مارنا بیان ہوا ہے [7] انہیں مراتب کا خیال کرنے کی جانب اشارہ ہو اور جب مقصد اسی سے حاصل ہوتا ہے تو اوپر والے مرحلے تک پہنچنا صحیح نہیں ہے۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اس طرح نافرمانی کبھی مردوں میں بھی پیدا ہوتی ہے تو کیا

مردوں کو بھی یہی سزا ملنی چاہئے ۔

جواب میں یہ کہنا ضروری ہے کہ ہاں بالکل، مردوں کو بھی عورتوں کے مانند اپنے فرائض سے روگردانی کی صورت میں سزا ملنی چاہئے ، لیکن اس بات کی جانب توجہ رکھنی چاہئے کہ بعض مردوں میں آزار دینے (سائیزم) کی حالت موجود ہوتی ہے اگر یہ بیماری شدید ہوئی تو اس کا علاج عورت کے ذریعے تنبیہ بدنی نہیں ہے کیونکہ:

اولاً: اس بیماری کا علاج مار پیٹ سے نہیں کیا جاتا۔

ثانیاً: اکثر عورتوں میں مار پیٹ کی طاقت نہیں۔

ثالثاً: حاکم شرع کی ذمہ داری ہے کہ مختلف مردوں کو مختلف طریقوں سے سزا دے کر انہیں سمجھائیں

خداوندعالم آیہ شریفہ کے آخر میں دوبارہ مردوں کو متنبہ کرتا ہے کہ گھر میں اپنی سرپرستی کے مقام کا غلط استعمال نہ کریں اور خدا کی قدرت جو سب قدرتوں سے بلند ہے کے بارے میں سوچیں کیونکہ خداوندعالم بلند مرتبہ اور سب سے بڑا ہے۔[8]

حواشی

[1] اکثر الخیر فی النساء، من لایحضرہ الفقیہ، ج ۳،ص ۳۸۵۔

[2] الکافی، ج ۵ ص ۳۳۲۔

[3] مستدرک الوسائل، ج ۱۴،ص ۱۵۰۔

[4] مستدرک الوسائل، ج ۱۴،ص ۲۵۲

[5] تھذیب الاحکام، ج ۷ ص ۴۰۰۔

[6] مستدرک الوسائل ج ۱۴،ص ۱۶۵۔

[7] تفسیر برھان، ج ۱ ص ۳۶۷۔(بہ نقل از تفسیر افضل، ج ۱ ص ۵۳۲)

[8] برگرفتہ از تفسیر نمونہ، ج ۳ ص ۴۱۱، ۴۱۶۔

قرآن لوگوں کو کیوں افسانوی جانوروں سے ڈراتا ہے تاکہ وہ واجبات پر عمل کریں؟

مختصر جواب

۱۔قرآن مجید نے ایک جگہ پر بھی یہ نہیں کہا ہے کہ افسانوی جانوروں سے ڈرو یا ڈرایا ہو۔

۲۔البتہ جو بعض روایات میں بعض گناہوں کی سزا کے بارے میں آیا ہے، (جیسے کہ وہ لوگ جو مسلمان ہیں اور شراب پیتے ہیں) اُن پر ہزار سر رکھنے والے اژدھوں سے عذاب کیا جائے گا[1] اس کا خمس کے مسئلہ سے کوئی ربط نہیں ہے۔

۳۔سائنسدانوں اور اسلامی معارف کے علماء، کے نزدیک، عمل اور اس کے نتیجہ کے درمیان فرق واضح ہے، مثال کے طور پر سائنس کی نظر میں مٹی کیمیاوی عمل اور ردعمل کے بعد ایک میٹھے میوے کی صورت میں تبدیل ہوتی ہے، اور میوہ انسان کے بدن میں خون، ہڈیوں اور مغز کے خلیوں کے ضروری مواد میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ پس اگر کوئی سائنسداں مٹی اور خون میں ظاہری شباہت نہ ہونے کی وجہ سے مزاق اُڑائے گا تو وہ اس کی جہالت اور نادانی ہوگی۔ اسلامی علماء کی نظر میں جس طرح مٹی، خون اور غذائی مواد میں تبدیل ہوتی ہے، انسانی اعمال کے نتائج بھی ممکن ہے کہ ہزار سر والے اژدھا کی صورت میں تبدیل

ہوجائیں۔[2]

پس بہتر ہے کہ علوم اور معارف کی توہین کرنے کے بدلے انہیں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

حواشی

[1] عن علی بن عندلیب بن موسی، عن اسماعیل بن سلیمان عن انس بن مالك قال: قال رسول اللهﷺ ان فی جهنم لوادیا یستغیث منه اهل النار كل یوم سبعین الف مرة فی ذلك الوادی بیت من نار فی ذلك البیت جب من نار، فی ذلك الجب تابوت من نار، فی ذلك التابوت حیة لها الف راس فی كل راس الف فم فی كل فم عشرة الاف ناب و كل ناب الف ذراع قال انس قلت یا رسول اللهﷺ لمن كون هذا العذاب قالﷺ لیشربة (لشارب) الخمر من حملة القرآن، بحارالانوار ج ۷٦، ص ۱۴٦۔

[2] حسن ثقفی، انسان و اندیشہ، تلخیص، کتاب اتحاد عاقل بہ معقول آیۃ اللہ حسن زادہ آملی ص ۵۱۔

ایسا قرآن کس طرح ہمیشہ کے لئے رہنما ہوسکتا ہے جس کی آیتیں خود اسی کی دوسری آیتوں کی نفی و ترمیم کرتی ہوں؟

مختصر جواب

قرآن اپنی شہادت کے مطابق ایسی کتاب ہے جو عالم گیر ہے [ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ۝۹۰] اور کسی زمانے یا جگہ یا کسی قوم سے مخصوص نہیں ہے: [نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ۝]۔

جو آیات اللہ کی طرف سے اس میں نازل ہوئی ہیں وہ اس طرح کی ہیں کہ جو تاریخ کے ہر موڑ پر اور ہر زمانے میں انسانی ہدایت کی ضرورتوں کو پورا کریں گی اور ان کی ہدایت کے لئے چراغ کی طرح جلتی رہیں گی اور انسانیت اس کے معارف کے چشمہ سے سیراب ہوتی رہے گی۔

چونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی آخری پیغمبر اور اسلام بھی آخری اور مکمل دین ہے پیغمبر اسلام کے بعد کوئی پیغمبر نہیں بھیجا گیا اور اسلام دین خاتم ہے۔ خاتمیت خود قرآن کی جامعیت اور جاودانگی پر دلیل ہے۔

قرآن کی تاریخ اور تفسیر بھی اس بات کی شاہد ہے کہ قرآن کی برکت سے ہی ہر

زمانے میں دانشوروں کے لئے معارف نو کے دریچے کھلے ہیں اور قرآن نے انسان کی عبوری اور ابدی دونوں طرح کی ضرورتوں کو پورا کیا ہے۔ البتہ یہ کام کلیات اور اصول ہدایت کو بیان کرنے اور علم و اجتہاد کے ماہرین کے ذریعہ اصول سے فروع کو حاصل کرنے کا راستہ انجام پایا ہے۔ یہ جو آپ نے کہا ہے کہ قرآن نے بارہا اپنی آیات کی نفی و ترمیم کی ہے، تو اس کا کوئی درست مفہوم نہیں ہے؛ کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن کی کوئی آیت کسی دوسری آیت کی نفی نہیں کرتی اور ان میں کسی طرح کا تناقض، ٹکراؤ اور باطل راہ نہیں پا سکتا۔ ممکن ہے اس جملہ سے آپ کی مراد یہ ہو کہ قرآن میں نسخ پایا جاتا ہے لیکن یہ خیال رکھنا چاہئے کہ قرآن میں نسخ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ آیت دوسری آیت کی نفی یا اس میں ترمیم کر رہی ہے؛ چونکہ نسخ کا مطلب یہ ہے کہ شروع سے ہی اس آیت کا حکم وقتی اور عبوری تھا اور جب اس کا وقت ختم ہو گیا تو دوسرا حکم آ گیا، نہ یہ کہ شروع میں حکم ابدی تھا بعد میں اس کے اندر ترمیم کی گئی۔ لہٰذا اگر ظاہری اعتبار سے کچھ آیتوں میں تناقض یا تضاد پایا جاتا ہو تو یہ ظاہری اور عام نگاہ میں ہے۔ اور چونکہ قرآن کی بعض آیتیں دوسری آیتوں کی تصدیق کرتی ہیں لہٰذا مفسرین کے بیان سے ان کا تضاد و تناقض ختم ہو جاتا ہے۔

تفصیلی جواب

قرآن جیسا کہ وہ خود ہی شہادت دیتا ہے، ایک عالمگیر اور ہمیشگی کتاب ہے اور انسان کی ہر موقع و مقام کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے نیز نہ کسی نژاد سے مخصوص ہے اور نہ ہی کسی طرح کے آداب و رسوم سے [ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ۝۹۰][1]۔ [نذیراً للعالمین][2]۔

اللہ نے قرآن کے معارف و مضامین کو اس طرح منتخب کیا ہے کہ تاریخ کے ہر موڑ اور ہر موقع و مقام پر تمام لوگ اس کے چشمہ معارف سے سیراب ہو سکتے ہیں۔ قرآن اور اس

کی تفسیر کی تاریخ بھی اس بات تک پہنچاتی ہے کہ قرآن ہی کی برکت سے ہر زمانے میں دانشوروں کے لئے نئے معارف کے دروازے کھولے گئے ہیں اور اس کے معارف کے چشمہ جوشاں نے ہر زمانے کی ضرورتوں اور سوالات کے جنگلوں کو سینچا ہے اور معارف الٰہی کے پیاسوں کو سیراب کیا ہے۔

قرآن کریم کی جامعیت، جاودانگی اور عالمگیری کے لئے بہت سے راستوں سے استدلال کیا جاسکتا ہے جن میں سے بعض کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جارہا ہے:[3]

۱۔قرآن اس سلسلہ میں فرماتا ہے [مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ][4] ہم نے قرآن میں کوئی چیز چھوڑی نہیں ہے۔ [اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ......][5] وغیرہ۔

یہ آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دین اسلام کامل ہوگیا ہے اور جو چیز کہی جانی چاہئے تھی اور جو احکام وقوانین انسان کے لئے بنائے جانے چاہئے تھے وہ تیار ہوچکے ہیں۔

۲۔ امام صادق علیہ السلام سے معارف قرآن کی تازگی اور جدیدیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: قرآن کی تازگی اس میں ہے کہ اللہ نے اسے کسی خاص زمانے یا خاص لوگوں کے لئے نہیں بھیجا اور وہ ہمیشگی اور ہرجائی ہے، اور ہر زمانے میں نیا ہے اور ہر طرح کے لوگوں کے درمیان قیامت تک شیریں و دلچسپ ہے۔[6]

۳۔ خاتمیت ،قرآن کی جامعیت اور جاودانگی پر دلیل ہے؛ کیونکہ انبیاء کے بھیجنے کا فلسفہ یہ تھا کہ اللہ وحی کے ذریعہ لوگوں کی ہدایت فرمائے اور عقائد، احکام وقوانین کے بیان کے ذریعہ انہیں ہدایت اور معنویت کے راستہ پر لگادے اور چونکہ انسان کی زندگی میں ہمیشہ تغییر وتبدل اور ترقی کمال ہے لہٰذا ایسا دین بھیجنے کی ضرورت تھی جو تمام انسانی ضرورتوں پر

مشتمل ہو،اس لئے خاتم الانبیاء اور نئے دین میں ایسی خصوصیت کا ہونا ضروری ہے جس سے نبوت،شریعت اور کتاب کی تجدید کی ضرورت نہ پڑے۔

دوسرے الفاظ میں: ہمیشہ کے لئے ہونا اور انسان کی ضروت ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ اس پر کبھی بھی کہنگی اور فرسودگی کا غبار نہ بیٹھے اور وہ ہمیشہ نیا اور تازہ رہے۔قرآن کے ناقابل استفادہ اور پرانا نہ ہونے کا راز یہ ہے کہ قرآن ایک تشریعی وجود ہے جو فطرت انسان کے تکوینی وجود سے ہم آہنگ ہے اور فطرت میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔

اس کے علاوہ قرآن ایسی کتاب ہے جو صرف عقائد و احکام، اقوام کے احوال، ہار جیت کے اسباب، امتوں کی تاریخ، جہان ابدیت کی توصیف اور خودسازی و انسان سازی کی راہ وصول بیان کرنے کی کتاب نہیں ہے بلکہ ہمیں ایسے راہنماؤں کی طرف لے جاتی ہے جو راستہ بھر لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ یہ اولیائے دین اور راسخون فی العلم ہیں جو آیات متشابہات کو آیات محکمات کے ذریعہ حل کر سکتے ہیں اور روش اجتہاد کی بنیاد ڈال کر ہر زمانے میں احکام مستحدثہ اور مسائل متغیرہ کا استنباط کر سکتے ہیں۔قرآن نے خاتمیت کے دور میں راسخون فی العلم کی طرف رجوع کو کہا ہے جو کلی منصوبہ کے ذریعہ امت کی راہنمائی کرتے ہیں اور زمان و مکان کے مطابق جزئی احکامات کی توضیح وتفسیر کرتے ہیں۔ اجتہاد کا یہی کردار ہے۔[7] لہٰذا ان علماء کا فریضہ یہ ہے کہ وحی کے ختم نہ ہونے والے منابع سے استفادہ کرتے ہوئے اور موضوعات احکام کے تغییر وتحول کے مدنظر کلیات کی تطبیق اور احکام کی تفسیر کریں، ہوسکتا ہے کوئی مسئلہ صدر اسلام میں درپیش نہ رہا ہو لیکن آج درپیش ہو اور ضروری سمجھا جا رہا ہو۔علماء اور مجتہدین کے ذریعہ جزئیات کو کلیات پر منطبق کر کے اور استنباط کی روش کو اپنا کر نئی ضرورتوں کا جواب دیا جاتا ہے۔درحقیقت اجتہاد کا مطلب یہی ہے اور اگر قرآن نے ہر چیز کو الگ الگ ذکر کیا ہے اور ہر چیز کا بیان اس میں موجود ہے[8] تو اس کا مطلب بھی یہی

ہے۔

اس نسبتا طویل تمہید کے بعد اصل مسئلہ کو بیان کرتے ہیں۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن ظاہری لحاظ سے خوبصورت (فصیح و بلیغ) اور معنوی لحاظ سے موافق و ہم آہنگ ہے، اس طرح کہ کسی طرح کا اختلاف اور ناموافقت اس کے آیات و احکام میں نہیں پایا جاتا۔ قرآن کی کوئی آیت دوسری آیت کی نفی نہیں کرتی بلکہ بعض آیات دوسری آیات کی تصدیق کرتی ہیں اور کسی طرح کا تناقض اور باطل ان میں راہ نہیں پاسکتا[9] [کیا قرآن کے بارے میں نہیں سوچتے ہو؟ اگر اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو تم اس میں شدید اختلاف پاتے][10]۔

لیکن اگر نفی و ترمیم سے آپ کی مراد، نسخ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ لغت میں نسخ کے معنی زائل کرنے اور نابود کرنے کے ہیں، یعنی کسی چیز کو باطل کر کے اس کی جگہ کسی اور چیز کو لانا[11]۔ اور اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت اسلامی میں سے ایک ثابت شدہ حکم کو اٹھا لینا اور یہ اس کی میعاد (مدت) ختم ہونے کے سبب ہے۔[12]

قرآن کے بارے میں تین طرح کے نسخ کا تصور کیا جاسکتا ہے:

۱۔ حکم اور تلاوت دونوں نسخ ہوجائیں۔ یعنی قرآن کی ایک ایسی آیت نسخ ہوجائے جس میں احکام الٰہی میں سے کوئی حکم بیان کیا گیا تھا۔ یہ نسخ چونکہ تحریف قرآن کے معنی میں ہے لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے۔

۲۔ حکم کو نسخ نہ کیا جائے بلکہ صرف تلاوت نسخ ہو اس طرح سے کہ آیت کو ہٹا لیا جائے لیکن اس کا حکم باقی رہے۔ نسخ کی یہ قسم بھی مختلف وجوہات کے سبب ممکن نہیں ہے۔

۳۔ حکم نسخ ہوجائے لیکن تلاوت برقرار رہے۔ نسخ کی یہ قسم ممکن ہے اور قرآن میں واقع بھی ہوئی ہے اور تمام مفسرین نے اس کو قبول کیا ہے۔

البتہ یہ نسخ نہ تو تناقض کلام ہے اور نہ ہی اختلاف نظر اور نہ ہی نظر ثانی بلکہ ایک حکمی اختلاف ہے جو مصداق کے سبب وجود میں آیا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ایک مصداق کسی خاص حالت میں ایک خاص مصلحت رکھتا ہو لہٰذا اس کے لئے ایک خاص حکم آئے گا، اور پھر جیسے ہی وہ خاص مصلحت ختم ہوجائے تو وہ حکم بھی اٹھ جائے گا یعنی وہ پہلے سے ہی وقتی اور محدود مصلحت کا حامل تھا۔

قرآن کی بعض آیتیں مثلا سورہ نمل کی 101ویں اور سورہ بقرہ کی 106 و 107ویں آیتیں اسی بات کو بیان کرنا چاہتی ہیں۔[13]

البتہ نسخ کے فلسفہ کے بارے میں یوں کہنا بہتر ہوگا کہ قرآن کے نزول کا مقصد انسانی معاشرہ کی تعمیر ہے، انسانی معاشرہ ایک ایسے بیمار کے مثل ہے جو شفا کے نسخہ کا ضرورتمند ہے، ظاہرسی بات ہے کہ بیمار کی شفا کے لئے کبھی دوا کے بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن کریم بھی ان انسانوں کے لئے نسخہ شفا ہے جو جہل، غفلت، خودخواہی وغیرہ میں گرفتار ہیں اور معنوی حقائق اور اعلی انسانی صفات و کمالات سے لاعلم ہیں۔ ان بیماروں کی نجات کے لئے ایک ماہرانہ منصوبہ کی ضرورت ہے جو قدم قدم پر ان کی روح و جان کو اخلاقی پلیدیوں سے پاک کر کے ان کی جگہ اخلاقی کمالات کو جاگزیں کرتا رہے۔ نسخ ایک ایسے معاشرہ کے لئے اجتناب ناپذیر ہے جو پست اور گرے ماحول سے عالی اور بلند مرحلہ کی طرف ارتقاء کررہا ہو۔ کیونکہ بہت سی جگہوں پر دفعی اور اچانک قسم کا کام ممکن نہیں ہوتا بلکہ زینہ بزینہ کام کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا معاشرہ کے پست ماحول سے عالی ماحول کی طرف جانے کے زمانے کی منسوخ آیتیں وقتی اور عبوری علاج کا حکم رکھتی ہیں۔[14]

لہٰذا ناسخ ومنسوخ ظاہری لحاظ سے آپس میں منافات رکھتے ہیں لیکن درحقیقت ان میں کوئی تناقض اور ٹکراؤ نہیں ہے؛ کیونکہ دونوں ہی اپنی خاص مصلحت رکھتے ہیں، ناسخ میں

منسوخ سے بعد والی مصلحت ہے۔

قرآن کی آیات محکم ومتشابہ بھی اسی طرح ہیں۔ جیسا کہ کہ قرآن خود فرماتا ہے کہ اس کی آیتیں محکمات ومتشابہات پر مشتمل ہیں۔ ہوسکتا ہے بشر کی فکری نارسائی اور ماورائے طبیعت حقائق و معانی کی بلندی و برتری اسی طرح روزمرہ کی ضرورتوں کے لئے بنائے گئے الفاظ وعبارات کی نارسائی قرآن میں آیات متشابہ کے وجود کا سبب ہوں کیونکہ فطرتا ان الفاظ میں ان بلند معانی کو بیان کرنے کی گنجائش اور وسعت نہیں ہوتی۔[15]

انبیاء الٰہی درحقیقت دانا و نادان اور عقلمند واحمق ہر طرح کے انسان کے لئے مبعوث ہوئے بہت سے اعلی مفاہیم اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ ہر انسان انہیں نہیں سمجھ سکتا بلکہ صرف خاص افراد ہی ان کو درک کرسکتے ہیں۔ ان کا علم، راسخون فی العلم کے پاس ہے۔[16]

لہٰذا یہ ظاہری اختلافات اسی سبب ہیں اور یہ بات کسی طرح بھی آیات کے تناقض یا نفی وترمیم پر دلالت نہیں کرتی لہٰذا نتیجہ میں انجام تاریخ تک انسان کے لئے اس کی راہنمائی سے بھی منافی نہیں ہے۔

حواشی

[1] انعام، ۹۰۔

[2] مدثر، ۳۶۔

[3] مزید معلومات کے لئے: اشاریہ: قرآن میں رطب و یابس، سؤال ۱۳۵ سائٹ ۱۱۰۱

[4] انعام، ۳۷

[5] مائدہ، ۳

[6] بحارالانوار، ج ۸۹، ص ۱۵؛ نورالثقلین، ج ۳، ص ۲۰۷۔

[7] ایازی، سید محمد علی، جامعیت قرآن، ص ۵۱۔ جامعیت اور خاتمیت کے بارے میں مزید معلومات کے

لئے رجوع فرمائیں: خاتیمت، مرتضی مطہری؛ خاتمیت از نظر قرآن و حدیث، جعفر، سبحانی؛ راہنما شناسی، محمد تقی، مصباح یزدی۔

[8] نحل، ۸۹۔

[9] فصلت۔، ۴۱۔ ۴۲۔ یہ شکست ناپذیر کتاب ہے جس میں نہ آگے سے نہ پیچھے سے کسی طرح کا باطل نہیں آ سکتا چونکہ حکیم اور شائستہ حمد خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ علامہ طباطبائی کا نظریہ ہے کہ اس آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ احکام قرآن قابل تغییر نہیں ہیں اور نہ اس کے کسی حکم کو اٹھا کر اس کی جگہ کوئی اور حکم لایا جا سکتا ہے (در محضر علامہ طباطبائی، محمد حسین رخشاد، ص ۲۷۶)

[10] قریشی، سید علی اکبر، قاموس قرآن، ج ۷، لفظ نسخ۔

[11] خوئی، سید ابولقاسم، البیان، ص ۲۷۷۔ ۲۷۸

[12] نساء، ۸۲۔

[13] ہم جس آیت کو نسخ یا ترک کرتے ہیں اس سے بہتر یا اسی طرح کی آیت لے آتے ہیں۔۔۔ بقرہ، ۱۰۶۔ دیکھئے: فخر رازی، التفسیر الکبیر، ج ۳ و ۴، ص ۲۲۶؛ تفسیر نمونہ، ج ۱۱، ص ۴۰۵، ج ۱، ص ۳۸۸۔ کچھ منسوخ آیتیں یہ ہیں: ۱۵ و ۱۶ سورہ نساء جو سورہ نور کی دوسری آیت کے ذریعہ نسخ ہوئی ہیں؛ اسی طرح سورہ مجادلہ کی ۱۲ ویں آیت جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خلوت میں بات کرنے کے لئے صدقہ رکھا گیا ہے اور یہ آیت اسی سوری کی ۱۳ ویں آیت کے ذریعہ منسوخ ہوئی۔

[14] احمدی، مہدی، قرآن، ص ۱۰۳۔ ۱۱۲۔

[15] ایضا۔

[16] آل عمران، ۷، نساء ۱۶۲۔

قرآن مجید کیوں آیہ، آیہ کی صورت میں ہے؟ قرآن مجید کے سوروں میں سے کونسا سورہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یکبارگی نازل ہوا ہے؟

مختصر جواب

قرآن مجید دوصورتوں میں، یک بارگی اور تدریجی (آیہ اور سورہ) نازل ہوا ہے اس کے تدریجی نزول کے لئے بعض دلائل ذکر ہوئے ہیں:

1) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک کو محکم کرنے کے لئے

2) تا کہ وحی کا سلسلہ جاری رہے اور آیات کا تدریجی نزول پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے لئے دل گرمی اور تثبیت کا سبب بنے

3) رک رک کر اور فاصلہ کے ساتھ لوگوں کے لئے پڑھا جائے تا کہ لوگ آسانی کے ساتھ اسے سمجھ سکیں اور حفظ کر سکیں اور قرآن مجید کا علم اس کے عمل کے ہمراہ ہو

چونکہ قرآن مجید میں بہت سے مطالب بیان کئے گئے ہیں؛ اس لئے ضروری ہے کہ یہ مطالب طبقہ بندی کی صورت میں اور ان مطالب میں سے ہر مطلب دوسرے متناسب مطالب کے ساتھ ایک مجموعہ کی صورت میں ہو اور دوسرے مطالب سے الگ ہو اسی وجہ سے

قرآن مجید آیات اور مستقل سوروں پر مشتمل ہے

قابل ذکر بات ہے کہ ہر آیت کی جگہ اور ابتدا خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توسط سے انجام پائی ہے اور اسے تعبدی طور پر قبول کرنا چاہئے البتہ قرآن مجید کے بعض چھوٹے سورے دفعتہً نازل ہوئے ہیں، ان کا نام تفصیلی جواب میں آیا ہے

تفصیلی جواب

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ قرآن مجید پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تیئیس (23) سال کی مدت میں تدریجی صورت میں نازل ہوا ہے دوسری طرف سے ہم پڑھتے ہیں کہ قرآن مجید ماہ رمضان میں اور ایک ہی رات میں نازل ہوا ہے،[1] یہ آیات تاکید کرتی ہے کہ قرآن مجید ماہ رمضان میں نازل ہوا ہےاور اس کے علاوہ آیہ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۚ﴿۱﴾ [2] اور آیہ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ [3] بیان کرتی ہیں کہ قرآن مجید ایک شب میں نازل ہوا ہے مذکورہ تین آیتوں کا موازنہ کرنے پر واضح ہوتا ہے کہ وہ رات ماہ رمضان میں تھی

احادیث بھی اس کی گواہی دیتے ہیں کہ قرآن مجید دو صورتوں میں نازل ہوا ہے:

حفص بن غیاث نے نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت امام صادق علیہ اسلام سے پوچھا کہ خداوند متعال کا ارشاد ہےشَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ جبکہ قرآن مجید اول سے آخر تک بیس سال میں نازل ہوا ہے؟ امام نے فرمایا: پورا قرآن ماہ رمضان میں بیت المعمور پر نازل ہوا ہے، اس کے بعد بیس سال کی مدت میں نازل ہوا ہے[4] اہل سنت کی روایتوں میں بیت المعمور کے بجائے بیت العزۃ آیا ہے

تفسیر صافی کے نویں مقدمہ میں، بیت المعمور کی رسول اللہ کے قلب سے تفسیر کی گئی ہے اور فرمایا ہے گویا اس کے نزول کا مراد قلب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، چنانچہ خداوند متعال نے

ارشاد فرمایا: نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ اس کے بعد بیس سال کی مدت کے دوران قرآن مجید کے قلب سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر نازل ہوا، جب جبرئیل آتے تھے، تو وہ وحی کو الفاظ میں پڑھتے تھے

قرآن مجید کے تدریجی نازل ہونے کی علت:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات کے دوران اگر کوئی واقعہ رونما ہوتا یا مسلمان کسی مشکل سے دوچار ہوتے تو ان واقعات کے بارے میں یا مشکل کو دور کرنے کے لئے یا سوالات کا جواب دینے کے لئے، چند آیات کا مجموعہ یا کوئی سورہ نازل ہوتا تھا ان مناسبتوں یا واقعات کو اصلاح میں اسباب نزول یا شان نزول کہتے ہیں، کہ بہت سی آیات کو دقیق طور پر سمجھنے کے لئے ان کا جاننا ضروری ہے

اس بناء پر قرآن مجید ہجرت سے قبل اور اس کے بعد 23 سال کی مدت میں مختلف مناسبتوں اور گوناگوں واقعات کے پیش نظر تدریجاً نازل ہوا ہے یہ نزول کبھی آیہ اور کبھی سورہ کی شکل میں انجام پاتا تھا، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا اس کے بعد تمام آیات جمع کی گئیں اور یہ مجموعہ، کتاب یعنی قرآن مجید کی صورت اختیار کر گیا

نزول کا یہ طریقہ، قرآن مجید کی خصوصیات میں سے ہیں اور اسے دوسری آسمانی کتابوں سے جدا کرتا ہے کیونکہ صحف ابراہیمؑ اور الواح موسیٰؑ دفعتہً نازل ہوئے ہیں اور یہی امر مشرکین کی طرف سے عیب ان کے بارے میں جوئی کا سبب بنا ہے

قرآن مجید میں ارشاد ہے: اور یہ کافر بھی کہتے ہیں کہ آخر ان پر یہ قرآن ایک دفعہ کل کامل کیوں نہیں نازل ہوگیا ہم اس طرح تدریجاً نازل کرتے ہیں تاکہ تمہارے دل کو مطمئن کرسکیں اور ہم نے اسے ٹھہر ٹھہر کر نازل کیا ہے .[5] دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے: اور ہم نے قرآن کو متفرق بنا کر نازل کیا ہے تاکہ تم تھوڑا تھوڑا لوگوں کے سامنے پڑھو اور ہم نے

خود اسے تدریجاً نازل کیا ہے[6] علامہ طباطبائی نے اس آیہ شریفہ کی تفسیر میں چند اہم نکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے: آیہ اپنے سیاق سے صرف نظر کرتے ہوئے تمام قرآنی معارف پر مشتمل ہے کہ یہ معارف خداوند متعال کے پاس الفاظ کی صورت موجود تھے کہ تدریجی صورت کے علاوہ انسان کے ذہن میں نہیں سما سکتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ تدریجاً نازل ہوجائیں، اس عالم کی خاصیت بھی یہی ہے، تاکہ لوگ آسانی کے ساتھ ان پر غور کرکے انہیں حفظ کریں اور اس حساب سے آیہ شریفہ وہی معنی بیان کرتی ہے جو آیہ االْمُبِيْنِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝[7] بیان کرتی ہے قرآن مجید کے تدریجاً اور ٹھہر ٹھہر کر نازل ہونے کا فلسفہ، علم و عمل کا قرآن مجید کے قریب ہونا اور اسے قبول کرنے میں لوگوں کی استعدادوں کا مکمل ہونا ہے[8] اور قرآن مجید کی آیات کا تدریجاً، جدا جدا، سورہ سورہ اور آیہ آیہ کی صورت میں نازل ہونا اس کے اصلی اعتقادات اور اس کے فرعی اعتقادات کو قبول کرنے میں لوگوں کی استعدادوں کو مکمل کرنا ہے اور کچھ ایسی مصلحتوں کے مطابق ہے کہ انسان کے لئے مد نظر رکھی گئی ہے کہ قرآن مجید کا علم اس پر عمل کے قریب ہو اور انسان کی فطرت و مزاج پر معارف و احکام کو حاصل کرتے ہوئے زیادہ دباؤ نہ پڑے اور وہ تنگ نہ آئے، اس کے معارف کو یکے بعد دیگرے درک کرے تاکہ قرآن مجید کی بھی وہی حالت نہ بنے جو تورات کی بنی تھی کیونکہ تورات کے دفعتہً نازل ہونے کی وجہ سے یہودیوں نے اسے قبول کرنے سے گریز کیا یہاں تک کہ جب تک نہ خداوند متعال نے ان کے سروں پر پہاڑ کو معلق کیا اسے قبول کرنے کے لئے حاضر نہیں ہوئے[9]

اس کے علاوہ قرآن مجید سے استنباط ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے تدریجی نزول کا فلسفہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمان احساس کریں کہ وہ مسلسل خداوند متعال کے خاص

کرم کے سائے میں ہیں اور حق تعالیٰ کے ساتھ ان کا رابطہ جاری ہے اس وحی کا جاری رہنا اور آیات کا نازل ہونا ہمت افزائی اور استحکام بخشنے کا سبب بنتا ہے[10]

مختلف زمانوں اور مختلف مناسبتوں پر آیات کے نازل ہونے کے بعد، انہیں سوروں کی شکل میں جمع کیا گیا اور تمام آیات ایک کتاب یعنی قرآن مجید کی صورت اختیار کر گئیں ہر سورہ کی آیات کی تعداد ایک تعبدی کا امر ہے اور یہ کام سب سے چھوٹے سورہ (کوثر جو تین آیات کی تعداد پر مشتمل ہے) سے لے کر سب سے بڑے سورہ (بقرہ جو 286 آیات پر مشتمل ہے) تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاص حکم اور دستور کے مطابق انجام پایا ہے اور کسی قسم کے دخل و تصرف کے بغیر آج تک اس صورت میں باقی ہے اور اس سلسلہ میں ایک راز مضمر ہے جو قرآن مجید کے معجزہ اور اس کی آیات کے تناسب سے مربوط ہے[11]

اس کے علاوہ مختلف آیات سے قرآن مجید کے سوروں کی تشکیل کی کیفیت کے بارے میں کہنا چاہیئے: ہر سورہ کی ترتیب، نظم اور آیات کی تعداد کا کام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی حکم سے انجام پایا ہے اور یہ ایک تعبدی کا امر ہے، اسے تعبدی طور پر قبول کرنا چاہیئے ہر سورہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے نازل ہونے سے شروع ہوتا تھا اور آیات نزول کی ترتیب سے اس میں درج ہوتی تھیں، جب دوسرا بسم اللہ نازل ہوتا تھا تو دوسرا سورہ شروح ہوتا تھا یہ آیات کی طبیعی ترتیب تھی کبھی یہ اتفاق بھی پیش آتا تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جبرئیل امین کے اشارہ پر حکم دیتے تھے تا کہ ایک آیت کو اس کی طبیعی ترتیب کے مخالف کسی دوسرے سورہ میں قرار دیں جیسے، آیہ شریفہ: وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡهِ اِلَی اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۱﴾ [12] کہ کہا گیا ہے کہ آیات آخری نازل شدہ یہ آیت میں سے ہے، لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دستور دیا کہ اسے سورہ بقرہ میں ربا اور قرضہ سے مربوط آیات کے درمیان آیت نمبر 281 کے

طور پر درج کریں

اس بنا پر آیات کو سوروں میں خواہ طبیعی ترتیب سے یا دستور و تعبدی کی ترتیب سے درج کیا گیا ہو بہر صورت خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیر نگرانی درج کیا گیا ہے اور اس کی پیروی کی جانی چاہئے اور ایسا نہیں ہے کہ ہر جگہ پر کسی مطلب کے ختم ہونے سے آیات ختم ہوتی ممکن ہے کسی مطلب کے درمیان میں، آیت تمام ہو جائے اور مطلب دوسری آیت میں جاری رہے، پس ہر آیت کا چھوٹا یا بڑا ہونا اس میں درج مطلب سے مربوط نہیں ہے بلکہ ایک تعبدی امر ہے ماضی میں جو آیات کے اندازہ کے بارے میں تھوڑا سا اختلاف رکھتے تھے، وہ اس لئے تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض اوقات کسی آیت کی تلاوت کے درمیان توقف فرماتے تھے اور تلاوت کو جاری نہ رکھتے تھے لوگ گمان کرتے تھے کہ آیہ ختم ہوگئی ہے اور ممکن ہے دوسری بار تلاوت کے دوران اس آیت کو بدون وقفہ جاری رکھا ہو[13]

لیکن جو سورے یکبار اور مجموعی صورت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

والضحیٰ،	الفاتحہ،	اخلاص،	کوثر،
تبت،	بینہ،	نصر،	الناس،
فلق،	مرسلات،	مائدہ،	انعام،
توبہ،	صف،	عادیات،	کافرون[14]

حواشی

[1] بقرہ، 185 شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ

[2] قدر، 1.

[3] دخان.3.

[4] کافی، نقل از تفسیر صافی، مقدمہ نہم.

[5] فرقان،32، وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿٣٢﴾

[6] اسراء.106، وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿١٠٦﴾

[7] زخرف،3 و4.

[8] لوگوں کی استعداد میں رشد و بالیدگی پیدا ہونا.

[9] طباطبایی، محمد حسین، ترجمہ فارسی المیزان، ج 13، ص 305 و 306.

[10] معروفت، محمد ھادی، علوم قرآنی، قم، موسسہ فرھنگی تمہید، 1380، ص 6160.

[11] علوم قرآنی، پیشین، ص 111.

[12] بقرہ، 281.

[13] علوم قرآنی، پیشین، ص 117.

[14] اسرار، مصطفی، دانستنیھای قرآن، ص 28، حسن زادہ، صادق، کلید قرآن، ص 134.

قرآن مجید، اعراب کے بغیر کیسے تحریف سے محفوظ رہا ہے؟

مختصر جواب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے ابتدائی زمانہ میں عربی رسم الخط بے نقطہ ہونے کے علاوہ اس کے حروف اور کلمات نشانہ اور علائم سے بھی خالی تھے اور قدرتی بات ہے کہ قرآن مجید بھی اس زمانہ میں معمول کے مطابق بدون اعراب تھا۔لیکن چونکہ صدر اسلام کے ابتدائی ایام میں مسلمان، حافظ قرآن اورعرب زبان تھے، اور قرآن مجید ان کی مادری زبان میں تھا، اس لئے اسے صحیح ڈھنگ پڑھتے تھے اور اس لحاظ سے کوئی مشکل نہیں تھی ۔ بعد والے مسلمان قرآن مجید کے بارے میں خاص اور کافی احترام اور دلچسپی رکھتے تھے، اس لئے وہ ان افراد سے قرآن مجید کو سیکھتے تھے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ نزدیک سے درک کر چکے تھے۔

لیکن پہلی صدی ہجری کے آخر پر غیر عرب اور اجنبی افراد مسلمان ہوئے اور اسلامی معاشرہ میں ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا، تو قرآن مجید کے خط میں علامتوں اور نشانیوں کی ضرورت کا شدت کے ساتھ احساس کیا گیا تا کہ قرآن مجید کو پڑھتے وقت غلطیاں سرزد ہونے نہ پائیں ۔اس لئے امام علی علیہ السلام کے شاگرد ابی الاسود دئلی کے توسط سے قرآن مجید میں

اعراب اور نقطہ گزاری کی گئی۔

نتیجہ کے طور پر چونکہ عرب لوگ، فطرتاً یا عربی زبان ان کی مادری زبان ہونے کے ناطے صرف ونحو کے قواعد سے آشنا تھے اور ان کے لئے علائم واعراب کی ضرورت نہیں تھی، لیکن غیر عربوں کے مسلمان ہونے اور ان کے لئے علائم واعراب کی ضرورت کے پیش نظر، اس امر کا سبب بنا کہ قرآن مجید میں اعراب گزاری کی جائے تا کہ وہ متوقع مشکلات سے دو چار نہ ہو جائیں ۔اس بنا پر قرآن مجید کے الفاظ میں اس لحاظ سے کسی قسم کی تحریف کا امکان نہیں ہے۔

تفصیلی جواب

پہلی صدی حجری کے پہلے نصف تک، قرآن مجید کی قرائت کی تنہا راہ سننے تک محدود تھی۔ بہت سے قاری اور حافظ قرآن، قرائت کو سینہ بہ سینہ اپنے سے پہلے والے قاریوں سے سیکھتے تھے اور ان قاریوں کی سند صدر اسلام کے مشہور قاریوں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام تک پہنچتی تھی ۔اس طولانی مدت کے دوران بہت سے قاری تربیت پا گئے جو بعد والی نسلوں کے لئے قرآن مجید کی صحیح قرائت کے محافظ تھے۔

دوسری صدی ہجری کے دوسرے حصہ کے اوائل میں، ایسے مسلمان اسلامی معاشرہ میں شامل ہوئے، جو عربی زبان سے آگاہ نہیں تھے۔ اس زمانہ میں قرآن مجید کے لئے اعراب وعلائم کی ضرورت کا شدت کے ساتھ احساس کیا گیا ۔ اسی زمانہ میں حضرت علی علیہ السلام کے ایک شاگرد ابو الاسود دئلی نے قرآن مجید میں اعراب گزاری کی ذمہ داری قبول کی اور اس کو پوری احتیاط اور ضروری دقت کے ساتھ انجام دیا۔ ابو الاسود قرآن مجید کی قرائت پر پورا تسلط رکھنے کے علاوہ (جو برجستہ قاریوں میں سے تھے) عربی زبان اور اس کے قواعد پر بھی کافی مہارت رکھتے تھے اور یہ وہی شخصیت تھیں، جس نے حضرت علی علیہ السلام کی ہدایات پر علم نحو

کے قواعد وضوابط تالیف کئے ہیں [1] ۔اس کے علاوہ اس کی اعراب گزاری قرآن مجید کے قاریوں اور حافظان قرآن سے پوشیدہ نہیں تھی اور اس طرح ہر قسم کی غلطی کے امکان کا دروازہ بند کردیا۔ اگر چہ ابوالاسود کی اعراب گزاری نے عربی زبان نہ جاننے والوں کے لئے فصیح عربی میں قرائت کو آسان بنا دیا، لیکن بہت سے ایسے قاری اور حافظ تھے جو اپنے پہلے والے قاریوں سے سن کر قرآن مجید کی قرائت سیکھتے تھے۔ چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ تاریخ قرائت کے مشہور قاری قرائت کی ایک سند ہیں ۔یعنی ان کی قرائت کا سلسلہ، صدر اسلام کے مشہور قاریوں، خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا حضرت علی علیہ السلام تک پہنچتا ہے، جبکہ خود حضرت علی علیہ السلام نے قرائت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھا تھا۔ اگر چہ بعض سندیں زیادہ معتبر ہیں، جیسے حفص کی عاصم سے روایت جو شیعوں کی ایک قرائت ہے۔

بعد والی اعراب گزاری میں (ابو الاسود کی اعراب گزاری کی نسخہ برداری اور اس کے تکامل کے سلسلہ میں) ہمیشہ قابل قبول قرائتوں سے تطبیق کی جاتی تھی اور یہی سلسلہ آج تک جاری ہے اور قرآن مجید کی موجودہ اعراب گذاری اپنے تکامل کے عروج پر پہنچی ہے اور سکون، تشدید، مد وغیرہ جیسی علامتیں اس میں اضافہ ہوئی ہیں [2]۔

قرآن مجید کی موجودہ اور مشہور قرائت جو سینہ بہ سینہ لوگوں میں منتقل ہوئی ہے، متواتر ہے اور اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے تائید شدہ ہے۔ امام صادق علیہ السلام نے ایک روایت کے مطابق اپنے ایک صحابی کو حکم دیا ہے کہ اقرء کما یقرو الناس۔۔۔جس طرح لوگ پڑھتے ہیں، تم بھی اسی طرح پڑھنا۔

عین روایت یوں ہے: سالم ابوسلمہ کہتے ہیں: میں سن رہا تھا کہ ایک شخص قرآن مجید کے بعض حروف کو لوگوں میں رائج طرز کے خلاف پڑھ رہا تھا اور اس نے آکر امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں اسی طرح ۔قرائت کی ۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: اس قرائت سے

پرہیز کرنا اور جس طرح لوگ قرائت کرتے ہیں اسی طرح قرائت کرنا۔۔۔[3]

اس بنا پر اسلام کی پوری تاریخ میں قرآن مجید کا متن، سینہ بہ سینہ اور دست بہ دست ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتا رہا ہے اور اس وجہ سے صدر اسلام سے آج تک ہمیشہ بہت سے قاری و حافظان قرآن مسلمانوں کے درمیان موجود ہوتے تھے اور وہ مقام و منزلت کے مالک ہوتے تھے۔ اس طرح قرآن مجید بالکل رسول خداﷺ کے الفاظ و قرائت کی صورت میں پوری تاریخ کے دوران رائج تھا اور قرآن مجید کی کتابت کے زمانہ میں رسم الخط کے ابتدائی ہونے، بے نقطہ اور بے اعراب ہونے، مختلف عرب قبائل کے لہجوں میں اختلاف اور بعض قاریوں کے ذاتی اجتہاد سے قرآن مجید کی رائج قرائت میں کوئی خلل نہیں پڑا ہے اور صرف بعض شخصی اور نادر قرائتوں میں کچھ غلطیاں وجود میں آئی ہیں جن کی طرف اسلامی معاشرہ میں کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ روایت میں ذکر کی گئی لوگوں کی قرائت کا مراد واقرء کما یقرء الناس بھی وہی قرائت ہے جو پوری تاریک میں مسلمانوں کے درمیان رائج رہی ہے۔ اسی طرح موجودہ قرآن مجید کی عاصم کی قرائت سے مطابقت اسی لحاظ سے ہے کہ عاصم کی قرائت عام لوگوں کی قرائت کے مطابق تھی [4]۔

البتہ چوتھی صدی ہجری کے اواخر تک کے خطاط اور خوشنویس قرآن مجید کو خط کوفی میں لکھتے تھے، لیکن خط نسخ نے پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں خط کوفی کی جگہ لے لی، اس صدی کے بعد، عصر حاضر تک رائج تمام نقطے اور علائم قرآن مجید میں لکھنا معمول کا کام بن گیا [5]۔ اس لئے اس جہت سے قرآن مجید کے الفاظ میں کسی قسم کی تحریف کا امکان نہیں ہے۔

حواشی

[1]۔ دایرۃ المعارف بزرگ اسلامی، ج ٥، ص ١٨٢۔ ١٩٠، مدخل ابوالاسود علوم قرآنی، محمد ہادی معرفت،

ص۱۷۲۔ ۱۷۳،مؤسسة التمہید ۔

[2]۔ ملاحظہ ہو: علوم قرآنی،ص۱۷٤و۱۷٥۔

[3]۔ ملاحظہ ہو: روش شناسی تفسیر قرآن،علی اکبر بابائی و دیگران،ص ۷۲، پژوہشکدہ حوزہ و دانشگاہ وسمت، ج اول،قم، ۱۳۷۸ش۔

[4]۔ ملاحظہ ہو: ایضاً ص ۷٥۔ ۷٦۔ علوم قرآنی، محمد ہادی معرفت، ص۲٤٦۔ ۲٤۷، مؤسسہ فرہنگی انتشاراتی التمہید ، ج اول،قم ۱۳۷۸ش۔

[5]۔ تاریخ قرآن کریم، سید محمد باقر حجتی،ص٤٦٥ و ٤٨٤ ، دفتر نشر فرہنگ اسلامی علوم قرآنی، آیت اللہ معرفت،ص ۱۸۳،مؤسسہ فرہنگی انتشاراتی التمہید ۔

صرف چند انبیاء علیہم السلام کے نام قرآن مجید میں ذکر ہونے کی کیا وجہ ہے؟

مختصر جواب

قرآن مجید سیرت، تاریخ یا معجم کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں انبیاء کی سوانح حیات اور ان کے ناموں کی فہرست درج کی جائے۔ بلکہ یہ ہدایت، تعلیم وتربیت، تزکیہ اور تذکر کی کتاب ہے۔ یہ مقصد، انبیائے گزشتہ اور کامل انسانوں کے بارے میں اسی قدر نام وحالات درج کرنے سے پورا ہوتا ہے۔ اگر قرآن مجید میں اس سے زیادہ افراد کے ذکر کرنے کی ضرورت ہوتی، تو ضرور ایسا ہی ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں، قرآن مجید نے تعلیم وتربیت کے مقام پر، تاریخ کے اقتباسات سے سنت الٰہی (فلسفہ تاریخ) سے اور نکات وحکمت کے عنوان سے استفادہ کیا ہے تاکہ اپنی الٰہی تعلیمات کو نفوس میں زیادہ سے زیادہ استحکام اور اثر ورسوخ بخشے اور اس کے اثر کو پائیدار بنائے۔ قرآن مجید کی مراد تاریخ نویسی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام قرآن مجید میں سو بار سے زیادہ ذکر ہوا ہے اور ان کا قصہ ۲۸ سوروں میں وسیع پیمانے پر بیان ہوا ہے، لیکن جو حصے صرف تاریخ اور داستان سے متعلق ہیں، جیسے حضرت موسیٰ کی تاریخ پیدائش اور وفات وغیرہ کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ صرف داستان کے حساس اور سبق آموز نکات کو بیان کیا ہے۔

تفصیلی جواب

سورہ مبارکہ نساء کی آیت نمبر ۱٦۳ اور ۱٦٤ اورسورہ غافر کی آیت نمبر ۷۸ میں قرآن مجید واضح طور پر بعض انبیاء (۲٥افراد) کے واقعات بیان کرتا ہے اور بہت سے انبیاء کے واقعات قرآن مجید میں ذکرنہیں ہوئے ہیں۔قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے یہ امر واضح طور پرمعلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں تمام انبیاء کی تاریخ تفصیل سے ذکرنہیں ہوئی ہے۔ حضرت موسی علیہ السلام، حضرت عیسی علیہ السلام اور حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے بارے میں ان کی زندگی سے متعلق بعض اقتباسات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ جبکہ بعض روایتوں میں انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار(۱۲٤۰۰۰)اوررسولوں کی تعداد ۳۱۳ بتائی گئی ہے۔[1]

مثال کے طور پر حضرت موسی کلیم اللہ علیہ السلام کا نام قرآن مجید میں سو بار سے زیادہ آیا ہے اوران کا قصہ قرآن مجید کے ۲۸ سوروں میں وسیع پیمانہ پر بیان ہوا ہے۔لیکن جو چیزیں محض تاریخ اور داستان سے متعلق ہیں، جیسے تاریخ پیدائش و وفات وغیرہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ذکرنہیں ہوئی ہیں بلکہ صرف حساس اورسبق آموز نکات بیان کئے گئے ہیں۔ [2] لہٰذا مناسب ہے کہ ہم اس فلسفہ پر روشنی ڈالیں۔

قرآن مجید کا نزول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت انسان کو سعادت وکمال کی طرف ہدایت کرنے کے لئے ہے تاکہ انسان اس راہ کو طے کر کے انسانیت کی سعادت کے عروج پر پہنچ جائے اورخلیفۃ اللہ کے مقام پر فائز ہو جائے۔ تاریخ کے اقتباسات کو بیان کرنا،توجہ مبذول کرانے اورنفوس میں کلام کے دل نشین ومؤثر ہونے کا سبب بن جاتا ہے اوراس طرح قرآن مجید کی تعلیمات کافی مدت تک پائیدار رہ سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے قصوں کا بیان ہونا مندرجہ ذیل بنیادوں پر استوار ہے:

(۱) انبیاء کی دعوت اورشیوہ تبلیغ کا بیان، اس کے ضمن میں انبیاء کا مقصد مشترک

ہے یعنی خدا کی عبادت اور طاغوتوں کو ترک کرنے کا بیان۔۔

(۲) انبیاء کی نسبت لوگوں کی پالیسی کا بیان اور ان کے علل وعوامل اور نتائج کی نشاندہی۔

(۳) انبیاء علیہم السلام کا خرافات، تحریفات اور طاغوت سے مقابلہ۔

(٤) طاغوتوں اور دشمنوں سے مومنین کا برتاؤ۔

(٥) معاشروں اور امتوں پر حاکم، الٰہی سنتوں کے تمام ادوار میں جاری رہنے کا بیان۔[3]

مذکورہ محور مندرجہ ذیل مقاصد کے لئے بیان ہوئے ہیں:

(الف) انبیاء کے وعظ ونصیحت سے تعلیم وتربیت حاصل کرنا، ضدی اور دشمن امتوں کے برے انجام سے عبرت حاصل کرنا، روش تعلیم سے استفادہ کرنا اور مخاطبین قرآن کے لئے اس کی تربیت وتبلیغ۔

(ب) قرآنی معیاروں کے مطابق انسانوں کا موازنہ ومحاسبہ کرنا یا خود جاری تاریخ کا حصہ بننا اور اس کے سورماؤں کا جانشین بننا۔

(ج) بعض انبیاء کی تاریخ کے بارے میں شبہات اور مشکلات کو دور کرنا اور انبیاء علیہم السلام کو افراط وتفریط پر مشتمل نامناسب اور ناروا نسبتوں سے منزہ و پاک کرنا۔ چنانچہ غلو کا یہ عالم تھا کہ یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اور عیسائیوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا۔[4] اور دوسری طرف سے حضرت موسی پر قتل کا الزام لگایا گیا۔[5]

(د) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کو ان کی راہ و روش کے سلسلہ میں اطمینان بخشنا اور دشمنوں کے مقابل میں ان کے صبر واستقامت کو تقویت بخشنا اور ان

کے دشمنوں کو مایوس کرنا اور انہیں ڈرانا اور دھمکانا۔[6]

ایک طرف، قرآن مجید میں داستانوں کو اسی قدر بیان کرنے سے مقاصد حاصل ہوتے ہیں اور اس سے زیادہ انہیں طولانی بنانے کی ضرورت نہیں ہے اور دوسری طرف ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ مشتے از خروارے، پس جب انبیاء اور امت میں سے یہ گروہ ایسے تھے، تو دوسروں کا بھی ان سے موازنہ کیا جاسکتا ہے اور اسلاف کا ان کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے اور ہوشیار رہنا چاہئے کہ ہمارا انجام بھی ماضی میں مصیبت سے دو چار ہوئی امتوں کے مانند نہ ہو۔

دوسری جانب انبیاء الٰہی علیہم السلام مختلف مراتب اور درجات کے مالک تھے۔[7] ان میں سے بعض صرف کسی دوسرے پیغمبر کے دین کے مبلغ تھے کہ ممکن تھا وہ پیغمبران کا ہم عصر ہوتا، جیسے: لوط کی تبلیغات اور حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے دین کے لئے یعقوب، اسحاق اور اسماعیل علیہم السلام کی تبلیغ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کے لئے انبیائے بنی اسرائیل علیہم السلام کی تبلیغ اور ممکن ہے کچھ انبیاء مخفی صورت میں تبلیغ کرتے ہوں اور یہود و نصاریٰ میں بھی ان کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہا ہے۔[8]

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ، چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اکثر دشمن بنی اسرائیل (یہودی) تھے اور امت اسلام کے حوادث، قوم یہود کے مشابہ ہیں، اس لئے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان دوسروں کی نسبت زیادہ تفصیل سے بہ تکرار بیان اور تکرار ہوئی ہے، تاکہ اسلام کے دشمن، یہودیوں پر حجت تمام ہو جائے اور مومنین اس سے عبرت حاصل کریں۔

آخر میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا مفید اور مناسب ہوگا کہ اگرچہ قرآن مجید میں ایشیاء اور مشرق وسطی کے اسلاف، انبیاء اور امتوں کے آثار کو ان سے عبرت حاصل کرنے

کے لئے بیان کیا گیا ہے، لیکن ممکن ہے مغربی مما لک میں بھی کچھ انبیاء مبعوث ہوئے ہوں، جن کا نام اور ان کی داستانیں قرآن مجید میں ذکر نہیں ہوئی ہیں۔

اس کا فلسفہ یہ ہے کہ ان انبیاء کی کتابوں، تبلیغی آثار اور ان کو قبول کرنے یا انکار کرنے کے اچھے اور برے نتائج سے مشرقی زمین اور مشرق وسطی کے لوگ کسی صورت میں آگاہ نہیں تھے۔ اس لئے حجاز اور مشرقی وسطی کے لوگوں سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ آپ ان کے آثار پر نظر ڈال کر عبرت حاصل کریں! نتیجہ کے طور پر تاریخی لحاظ سے اطلاع نہ رکھنے اور جغرافیائی لحاظ سے دور ہونے اور رابطہ کے وسائل کے فقدان کے بناء پر بعض انبیاء کا نام قرآن مجید میں نہ آنا اس امر کے علل وعوامل ہو سکتے ہیں۔ [9]

لیکن قرآن مجید کے خطاب میں حالات (زمان و مکان وغیرہ) کے اثرات من جملہ مباحث میں سے ہیں جس پر الگ سے بحث کی جانی چاہئے۔ ہم یہاں پر اس سلسلہ میں بحث کے طوالانی ہونے سے بچنے کے لئے متعلقہ منابع کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں: [10]

حواشی

[1]۔ بضا ئر الدرجات، ص۱۲۱۔ الخصال، ص۰۰ ۳ و ٦٤١ (منقول از راه راہنما شناسی،، ص۱۷)۔ بحار الانوار، ج۱۱،ص۰ ۳ و ۳۲ و ٤١ ۔

[2]۔ جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر تسنیم، ج۱،ص ٤٨ ۔

[3]۔سورہ آل عمران۔ ١٤٠۔

[4]۔سورہ توبہ۔ ۳۰ و....۔

[5]۔سورہ احزاب۔ ٦٩۔

[6]۔سورہ یوسف۔ ۱۲۳۔ ۱۲۰۔

[7]۔سورہ سراء۔ ٥٥، سورہ انعام۔ ۸۳ تا ۹۰، سورہ بقرہ۔ ۲٥۳۔

[8]۔ ملاحظہ ہو: المیزان، ج٦،ص١٤٦ وج٧،ص٣٤٥ و نیز علی شیروانی، درسنامہ عقاید،ص١٦٤۔

[9]۔ ملاحظہ ہو: جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر تسنیم، ج١،ص٥٢۔٣٩۔

[10]۔ ملاحظہ ہو: ہادوی تہرانی، مہدی، تاملات درعلم اصول فقہ، کتاب اول، دفتر چہارم،

سورہ بقرہ آیت نمبر 228 میں مرد کے لئے عورت پر برتری کا اعلان ہوا ہے کیا یہ خداوند عالم کے عادل ہونے کے خلاف نہیں ہے؟

مختصر جواب

یہ آیت مطلّقہ (طلاق شدہ) عورت کے بارے میں ہے اور طلاق رجعی کے احکام کے بارے میں ہے کہ ان کے شوہر عدہ کی مدت میں رجوع کر سکتے ہیں اور اس آیت نے ایک کلی اصل یعنی عورت کے حقوق اور وظیفے کے مساوی ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس آیت کے سیاق اور دوسری قرآنی آیات کے پیش نظر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید برتری وفضیلت کو تقوے میں سمجھتا ہے، احکام و وظائف میں مرد اور عورت کے درمیان مساوات کو قبول نہیں کرتا اور عدالت پسند ہے اسی بنیاد پر خاندان کی ذمہ داری، خداوند عالم کی جانب سے مردوں کو عطا کئے گئے خصوصیات کی وجہ سے انہیں کے ذمہ کی ہے۔

تفصیلی جواب

جس آیت کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ طلاق رجعی کے بارے میں ہے ارشاد ہوتا ہے:...اگر ان کے شوہر دوبارہ ان سے میل جول کرنا چاہیں تو وہ مذکورہ مدت میں

ان کے واپس بلا لینے کے زیادہ حق دار ہیں اور شریعت کے مطابق عورتوں کا (مردوں پر وہی کچھ (حقوق) ہے جو (مردوں کا) عورتوں پر ہے، ہاں البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک طرح کی فوقیت ہے اور خداوند عالم زبردست حکمت والا ہے۔ [1]

اس آیت میں جس چیز کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ ایک اہم اصل ہے اور وہ یہ کہ اسلام کی نظر میں عورت کے حقوق و فرائض ایک دوسرے کے مناسب ہیں (جیسا کہ مرد کے حقوق و فرایض ایک دوسرے کے مناسب ہیں) یعنی عورتوں کے حقوق ان کے فرائض کے ساتھ مساوی ہیں البتہ اس کے برعکس بھی یہی ہے؛ یعنی اگر کسی کے لئے حق قرار دیں تو اس کے مقابلہ میں اسی مقدار میں اس کی گردن پر فرائض بھی قرار دیں گے اور یہی اہم اصل مرد اور عورت کے مابین عدالت کا سرچشمہ ہے۔

اصل میں اسلام مرد اور عورت کے درمیان مساوات کا دعویدار نہیں ہے بلکہ مرد اور عورت کے درمیان عدالت کا مدعی ہے؛ اس لئے کہ اس بات سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرد اور عورت کے درمیاں روحی و جسمانی و...فرق ہے اور یہی اختلاف سبب بنتا ہے کہ ہر ایک کے فرائض دوسرے سے مختلف ہوں اور یہی عین عدالت ہے اور اگر ان اختلافات کے ہوتے ہوئے ہر ایک سے ایک ہی قسم کا فریضہ طلب کیا جائے تو یہ عدالت کے خلاف ہے۔[2]

اس امر کے پیش نظر کہ ایک کامیاب اور سعادتمند خاندان کے لئے طاقتور اور توانا مدیر کی ضرورت ہے اور تعصب سے دور سارے تجزیہ اس بات کے گواہ ہیں کہ مرد کی جسمانی کیفیت وغیرہ سبب بنتے ہیں کہ مرد ہی خاندان کا مدیر و سرپرست ہو۔[3]

لہٰذا ہر چند اسلام میں مرد کو عورت پر اس لحاظ سے برتری حاصل ہے لیکن یہ برتری اور درجہ ان کے لئے کچھ ایسے فرائض کا سبب قرار پاتا ہے جن کا مطالبہ عورتوں سے نہیں کیا گیا

ہے۔

مزہ کی بات تو یہ ہے کہ آیت آخر میں فرماتی ہے کہ: خداوند عالم غالب اور زبردست حکمت والا ہے یہ نورانی الفاظ اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ خداوند عالم کا قانون اوراس کی تدبیر سبب قرار پاتی ہے کہ معاشرے میں ہر شخص اپنے ان فرائض میں لگارہے جو خلقت کے قانون نے اس کے لئے معین ومشخص کئے ہیں جواس کے بدکی ساخت وساز کے مناسب ہیں۔[4]

نتیجہ یہ نکلا کہ اس آیت کے سیاق اور دوسری آیتوں کے پیش نظر، جس میں ارشاد ہوتا ہے کہ اعمال صالح کی جزا کے اعتبار سے مرداورعورت میں کوئی فرق نہیں ہے، [5] اور تقویٰ ہی برتری وفضیلت کا معیار ہے۔ [6] چاہے مرد ہو یاعورت کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس آیت نے مرد کی برتری وفضیلت فقط مدیریت اورسر پرستی کے لحاظ سے بیان کی ہے اورآیت کے معنی مردوں کی ہرطرح کی فضیلت و برتری نہیں ہے۔

حواشی

[1] سورۂ مبارکہ بقرہ، آیت 228۔

[2] مرداورعورت کے مابین عدالت کا یہ مطلب ہے کہ یہ دونوں ہر چیز میں برابر ہیں اورایک دوسرے کے ساتھ ساتھ قدم اٹھائیں؛عورت کی جنس کومرد سے مختلف فرائض انجام دینے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اسی لئے دونوں کے جذبات واحساسات جدا جدا ہیں تو قانون خلقت نے عورت کے کاندھوں پر ماں کے حساس فریضہ اور طاقتورنسل کی پرورش قرار دی ہے اسی لئے پیار ومحبت اور جذاب واحساسات کا زیادہ حصہ اسے عطا کیا ہے جب کہ اسی قانون کے مطابق معاشرے کے سخت اور بھاری کام مرد کی جنس کے حوالہ کئے ہیں اورفکر وعقل کا زیادہ حصہ اسی سے مخصوص ہے؛ لہٰذا اگر ہم عدالت سے کام لینا چاہتے ہیں تو معاشرے کی وہ ذمہ داریاں جن میں عقل، استقامت اورفکری کی ضرورت ہے مردوں کے حوالہ کرنی پڑیں گی اور جو ذمہ داریاں پیار ومحبت اور جذبات واحساس کی طالب ہیں عورتوں کے حوالے کرنی ہوگی، اسی وجہ سے خاندان

کی سرپرستی مرد کے ذمہ ہے اور اس کی نیابت عورت کے ذمہ قرار دی گئی ہے، بہرحال یہ چیز رکاوٹ نہیں بنتی کہ عورتیں معاشرے میں اپنے جسم و جان کے مطابق کام کی ذمہ داری سنبھالیں اور ماں کے فرائض کے ساتھ ساتھ دوسرے حساس امور بھی انجام دیں اس کے علاوہ یہ فرق اس امر میں بھی رکاوٹ نہیں ہوسکتا کہ معنوی، تقوا اور علم کے اعتبار سے عورتوں کی ایک جماعت بہت سے مردوں سے آگے بڑھ جائے۔ بہرحال کچھ قانون جیسے حق طلاق یا عدہ کی مدت میں رجوع یا قضاوت وغیرہ مردوں کے ہاتھ میں ہونے کا سرچشمہ یہی ہے اواسی واقعیت کا نتیجہ ہے، دیکھئے: تفسیر نمونہ، ج2، ص158۔

[3] یہ وہ مطلب ہے جس کی عملی طور پر مرد اور عورت کے حقوق میں مساوات کے مدعیوں نے تائید کی ہے؛ اس لئے کہ مرد اور عورت کے حقوق میں مساوات کے دعویدار ممالک کو جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ ملتا ہے کہ یہ ممالک اکثر اپنے بڑے عہدے کے افسر کو مردوں میں سے انتخاب کرتے ہیں اور انہوں نے مدیریت کے امور کو مردوں کے حوالہ کر رکھا ہے۔

[4] دیکھئے: تفسیر نمونہ، ج2، ص161۔

[5] سورۂ مبارکۂ نحل، آیت 97۔

[6] سورۂ حجرات، آیت 613اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور ہم ہی نے تمہارے قبیلے اور برادریاں بنائیں تا کہ ایک دوسرے کی شناخت کرے، یقینا خدا کے نزدیک تم سب میں بڑا عزت دار وہی ہے جو بڑا پرہیزگار ہو بے شک خدا بڑا واقف کار باخبر ہے۔

قرآن عربی زبان میں کیوں ہے کسی اور زبان میں کیوں نہیں؟

مختصر جواب:

انسان کے درمیان رابطہ برقرار رکھنے کیلئے زبان سب سے اہم وسیلہ ہے خداوند متعال گفتگو اور کلام کی طاقت کو انسان کی سب سے بڑی نعمتوں میں شمار کرتا ہے. جس کی طرف سورہ رحمن میں اشارہ ہوا ہے۔ جن پیغمبروں کو خداوند متعال نے انسانوں کی ہدایت کیلئے بھیجا ہے وہ اپنی قوم کے ساتھ رابطے کیلئے اس زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ جو ان کی قوم کی زبان ہوتی تھی اس طرح وہ اخلاقی قوانین، احکام اور عقاید کو ان ہی کی زبان میں ان کیلئے بیان کرتے تھے۔ بعثت سے پہلے جاہلی عرب کے تقاضوں کو دیکھ کر خداوند متعال نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عرب قوم کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ اس لئے انہیں، عربوں کی زبان میں گفتگو کرنی تھی۔ کہ جس معجزے کو وہ لے آئے تھے وہ قابل فہم ہو۔ اس لے قرآن مجید بھی، جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ تھا، عربی زبان میں نازل ہوا۔ اگرچہ عربی زبان کی ذاتی خصوصیات میں اس کا فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے قانون پذیر ہونا وغیرہ کو بھی نظر میں رکھنا چاہیئے۔

لیکن دوسرا سوال یہ ہے کہ خدائے متعال کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرب زبان ہی

کیوں تھے؟ اوران کی کتاب بھی عربی کیوں تھی؟

اس سوال کے جواب میں کھنا چاہیے کہ: اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ عرب ایسے لوگ ہیں، جو اپنی زبان، طریقہ کار، اورنسب میں خاص تعصب رکھتے ہیں (دین کے محفوظ رہنے کا اندرونی سبب) اور پوری تاریخ میں کوئی بیرونی حکومت انہیں اپنی زبان اور ثقافت تبدیل کرنے پر مجبور نہ کرسکی (دین کے تغییر نہ پانے کیلئے بیرونی سبب) اورعربی زبان میں ایسی قابلیت ہے، کہ زیادہ معنی کوکم الفاظ کے ذریعے، بغیرکسی ابہام اوراجمال کے بیان کرسکتی ہے۔ اس لئے حجاز (مکہ و مدینہ) کی سرزمین اورعربی زباں دین خاتم اور اس کی کتاب کومحفوظ کرنے کیلئے ایک بہترین دفاع ہے۔ اسی لئے عربی زبان میں قرآن نازل ہونے کی ایک دلیل اس کی دائمی حفاظت ہے۔

تفصیلی جواب

خدا کی سنتوں میں سے ایک سنت، انسانوں کی ہدایت کیلئے رسولوں کا بھیجنا ہے، خدا کے پیغمبر بھی انسانوں کے ساتھ رابطے کیلئے اس علاقہ کے لوگوں کے ساتھ جہاں وہ مبعوث ہوتے تھے ان ہی کی زبان میں بات کرتے تھے۔پیغمبر کا اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کرنا، خدا کی ایک اورسنت میں سے ہے، خداوندمتعال کا ارشاد ہے: ہم نے جس رسول کوبھی بھیجا اسی کی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ لوگوں پر باتوں کوواضح کرسکے [1] یہ سنت ان پیغمبروں کے بارے میں بھی سچ ہے جن کی دعوت عالمگیرتھی اور جوسب لوگوں کی ہدایت کیلئے مبعوث ہوئے تھے جیسے اولوالعزم پیغمبرلیکن وہ بھی اپنی ہی قوم کی زبان میں بات کرتے تھے ابتدائے بعثت سے جہاں وہ مبعوث ہوئے تھے۔ اوراگر ایسا نہ ہوتا تو اس پیغمبر کی شریعت، اس قوم میں ہی جہاں وہ مبعوث ہوئے تھے قابل فہم اورقابل قبول نہ ہوتی۔

قرآن کی، زبان ایک بلندتر حقیقت ہے اوراس سے پہلے کہ وہ عربی زبان میں

ڈھال جائے، وجود کے ایک ایسے مرحلے میں تھا جہاں انسانی عقلوں کو اس پر دسترس نہ تھی، خداوند متعال نے اسے اپنے اصلی مقام سے نیچے لاکر انسانوں کے لئے قابل فہم بنایا اور اسے عربی لفظوں کا لباس پھنایا تا کہ انسانی عقلیں اس سے مانوس ہوکر اس کے حقائق کو سمجھ سکیں۔[2]

پس قرآن کی اصل اور اس کی حقیقت، زبان اور کسی بھی زبانی سانچے میں ڈھلنے سے بلند تر ہے۔لیکن یہ کیوں عربی زبان میں نازل ہوا، اسی سلسلے میں کھا جاسکتا ہے کہ عربی زبان کی ذاتی خصوصیات کے علاوہ، کہ یہ زبان قانون پذیرھونے کے ساتھ زبانوں کے درمیان فصاحت و بلاغت کی چوٹی پر ہے۔ پیغمبر اکرم اس قوم میں مبعوث ہوئے جو عربی زبان میں گفتگو کرتی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کا پیغام پہنچانے کیلئے ایک قابل فہم معجزہ چاہئے تھا تا کہ لوگ اسے نہ جھٹلائیں۔ خدا پر ایمان لائیں اور دین کو پھیلانے میں کوشش کریں، البتہ اس کے قابل فہم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن کے سب حقائق کی فہم نہیں ہے، کیونکہ قرآن کے حقائق لا محدود ہیں، بلکہ اس سے مراد زبان کی فہم اور بعض حقائق کی اجمالی فہم ہے۔

بعثت سے پہلے عرب کی جاہلی قوم، زندگی کے سب سے پست لوازم کے ساتھ رہتی تھی اس لئے خدائے متعال نے پیغمبر کو عرب قوم میں مبعوث کیا، حضرت علی علیہ السلام، اسلام سے قبل اور پیغمبر کی آمد سے پہلے دور جاہلیت کے بارے میں فرماتے ہیں اللہ نے انہیں اس وقت بھیجا جب لوگ گمراہی میں متحیر اور فتنوں میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے خواہشات نے انہیں بھکا دیا تھا اور غرور نے ان کے قدموں میں لغزش پیدا کردی تھی، جاہلیت نے انہیں سبک سر بنا دیا تھا اور وہ غیر یقینی حالات اور جہالت کی بلاؤں میں حیران وسرگرداں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصیحت کا حق ادا کردیا، سیدھے راستہ پر چلے اور لگوں کو حکمت اور موعظہ حسنہ کی طرف

دعوت دی۔ [3]

یہ شرائط سبب بنے تھے کہ پیغمبر عرب قوم میں بھیجے گے پس قرآن کو بھی عربی زبان میں ہونا چاہیئے نہ کہ دوسری زبانوں میں۔ لیکن جو کچھ اہم ہے وہ قرآن سے فائدہ حاصل کرنا ہے جو عرب زبانوں کیلئے مخصوص نہیں خداوند متعال فرماتا ہے اگر ہم اس قرآن کو عجمی زبان میں نازل کردیتے تو یہ کہتے کہ اس کی آیتیں واضح کیوں نہیں ہیں، اور یہ عجمی کتاب اور عربی انسان کا ربط کیا ہے، تو آپ کہہ دیجئے کہ یہ کتاب صاحبان ایمان کیلئے شفا اور ہدایت ہے اور جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ہیں ان کے کانوں میں بہرا پن ہے اور وہ ان کی نظر میں کبھی نہیں آرہا ہے اور ان لوگوں کو بہت دور سے پکارا جائے گا [4]

یہاں پر ایک اور سوال اٹھتا ہے کہ خدا کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرب زبان تھے اور ان کی کتاب ہی عربی زبان میں تھی، یہ سعادت فارسی زبان والوں یا کسی اور زبان والوں کو کیوں نصیب نہ ہوئی؟ اس سوال کے جواب سے پہلے چند نکات بیان کرنا ضروری ہے پھر سوال کا جواب دیں گے۔

الف) جب آخری پیغمبر کی بات ہوتی ہے، کچھ افراد ہونے چاہیئے جو پیغام کو دریافت کرکے اچھی طرح سے اس کی حفاظت کرسکیں۔ (دین کے محفوظ رکھنے کا اندرونی عامل)

ب) دوسری جانب بعض افراد ہمیشہ دین کو نابود کرنے کی کوشش میں ہیں، جس طرح سب انبیاء کی تاریخ میں مشاہدہ کیا جاتاھے (بیرونی سبب دین کی تغییر کا) اس لئے اس طرح کی مشکل کیلئے کوئی حل ڈھونڈنا چاہیئے۔

ج) ایسا بالکل نہیں ہے کہ ہمیشہ (خصوصاً پیغمبر کی وفات کے بعد بھی) معجزہ یا خارق العادۃ کاموں کے ذریعے دین اور قرآن کی حفاظت کی جائے۔

ان مقدمات کے بعد انسانوں اور ان کے رہنے کے ماحول پر نظر ڈالتے ہوئے دیکھ لیں کہ کس ماحول میں اور کن شرائط میں یہ نکات متحقق ہونے کے لائق ہیں۔

اولا: عرب ایسے لوگ ہیں جو اپنی زبان، رسوم، قوانین، اورنسب کے بارے میں خاص تعصب رکھتے ہیں انہیں آسانی سے اپنی زبان اور ثقافت سے دور نہیں کیا جاسکتا یہاں تک کہ اس دور میں بھی عالمگیریت کے پروپگنڈے کے باوجود بھی وہ اپنے کپڑوں کو چھوڑ نہیں سکتے (اندرونی عامل محفوظ ہونے کا)

ثانیا: حجاز کے عرب کچھ اس طرح تھے کہ نہ صرف وہ اپنی مادری زبان سے الگ نہیں ہوسکتے تھے، بلکہ پوری تاریخ کے دوران کوئی بیرونی حکومت سے انہیں یہ کام کرنے پر مجبور نہ کرسکی، یعنی خارج سے انہوں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا (تغییر کیلئے خارجی عامل)

ثالثا: حجاز کے عربوں کی زبان ضمیروں کی کثرت کے باوجود، تثنیہ، مفرد، اور جمع کے ضمیروں کو آپس میں فرق، اور مذکر اور مؤنث کے صیغوں کا آپس میں مختلف ہونا مختلف قسموں کا جمع ہونا، کنایات اور استعارات وغیرہ سے مالا مال ہونا، سبب بنا ہے کہ زیادہ مطالب کو الفاظ کی کم تعداد کے ذریعے بیان کیا جائے بغیر اس کے کہ کوئی ابہام یا اجمال گوئی ہو۔

ان نکات کو مدنظر رکھ کر دین خاتم اور اس کی کتاب باقی رہنے کیلئے حجاز کی سرزمین اور عرب زبان دفاع کرنے کی بہترین طبیعی اور معمولی (غیر خارق العادۃ) راہ ہے قرآن نے اپنی داخلی جاذبیت اور دلپذیر آھنگ اور آوا کے ذریعے صحرانشین عربوں کے ذہنوں میں اپنی جگہ بنائی جو عرب فصیح او رموزوں کلام کے پسند کرنے والے تھے ار اس طرح مختلف لفظی تحریفوں سے یہ کلام محفوظ رہا اس طرح قرآن کا عربی زبان میں نازل ہونا اسکی دائمی حفاظت کیلئے تھا۔ [5] ہاں قرآن کا عربی زبان میں نازل ہونا، خدا کی طرف سے عرب زبانوں کے

لئے ایک خاص کرم اور رحمت تھی، اور اگر غیر عربی زبان میں نازل ہوتا، تو عرب زبان جن کی تعداد کم نہ تھی اس پر ایمان نہیں لاتے خدائے متعال کا ارشاد ہے: اگر ہم اسے کسی عجمی آدمی پر نازل کرتے اور وہ ان میں پڑھ کر سناتا تو یہ کبھی ایمان لانے والے نہیں تھے [6]

حواشی:

[1] سورہ ابراہیمؑ۔ ۴

[2] المیزان، (ترجمہ فارسی) ج ۸ ص ۱۲۲، ۱۲۳۔

[3] نہج البلاغہ، ترجمہ دشتی، خطبہ ۹۵۔

[4] سورہ فصلت۔ ۴۴

[5] فصلنامہ بینات، شمارہ ۲۷ ص ۳۸ اُا۴

[6] سورہ شعراء ۱۹۸۔۔۔ ۱۹۹

قرآن مجید کے مطابق خاندان میں مردوں کی عورتوں پر نگرانی کی کیا توجیہ ہے؟

مختصر جواب:

سورہ نساء کی آیت نمبر ۳۴ میں عورتوں پر مردوں کی نگرانی اور حکمرانی الرجال قوامون علی النساء عورتوں پر مردوں کے تسلط، زور زبردستی اور بالا دستی کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ اہل لغت اور ان کی پیروی میں اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ لفظ قوام سر پرستی، رسدات کے انچارج اور نگرانی کے معنی میں ہے۔ کیونکہ خاندان معاشرے کا ایک چھوٹا یونٹ ہوتا ہے، اس لئے قدرتی بات ہے کہ اس کو ایک بڑے معاشرے کے مانند ایک رہبری و سر پرستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے۔ بعض وجوہات اور مردوں میں موجود خصوصیات کی بنا پر یہ ذمہ داری مردوں کو ہی سونپی گئی ہے، مردوں کی یہ خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

1۔ فکری توانائی کا جذبات، لطف اور احساسات پر غلبہ،

۲۔ خاندان کی عزت وآبرو اور تقدس کا دفاع کرنے کی جسمانی طاقت

۳۔ بیوی بچون کی پرورش کے لئے مالی اخراجات برداشت کرنے کی ذمہ داری مرد پر عائد کی گئی ہے۔

قرآن مجید، حاکمیت اور سر پرستی کو صرف عدل و انصاف اور خداوند متعال کی رضا

مندی کے دائرہ میں جائز جانتا ہے اور خداوند متعال کے سامنے صرف تقوی اور پرہیز گاری کی برتری معیار ہے، نہ کہ جنسیت۔ قرآن مجید کے تھذیبی آداب کے مطابق مرد کی حکمرانی اور بالادستی میں تسلط، ظلم و زیادتی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، مذکروہ آیہ شریفہ سے جو مردوں کے عورتوں پر تسلط کا توہم پیدا ہوا ہے شائد قرآن کے محققین کی طرف سے لفظ" قوام" کے صحیح معنی بیان نہ کئے جانے کی وجہ سے ہے.

تفصیلی جواب

اصل مسئلہ" قوامیت" کے معنی کی بحث میں داخل ہونے سے پہلے ضروری ہے کہ اسلام میں عورت کے مقام ومنزلت کو واضح کرنے کیلئے چند نکات بیان کئے جائیں:

(ا)۔عورت، دنیا کی نصف آبادی، انسانی معاشرہ کی سرگرم رکن اور خاندان کی بنیاد کو تشکیل دینے والے دو ارکان میں سے ایک کی حیثیت سے پوری تاریخ میں اپنے بارے میں گونا گوں فیصلوں اور حکمتوں سے دو چار ہوتی رہی ہے، تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت، ہر معاشرے میں کسی نہ کسی طرح کی محرومی کے رنج اٹھاتی رہی ہے۔ اگرچہ مختلف معاشروں اور تمدنوں میں پوری تاریخ کے دوران اس امتیازی سلوک میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے، لیکن اس محرومی کے جاری رہنے اور واقع ہونے سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے، عربوں میں جاہلیت کے دوران بیٹیوں کو زندہ دفن کرنا، سومری معاشرہ میں عورتوں کا مردوں کے ہاتھوں قتل ہونا یا قرض ادا کرنے کی غرض سے ان کو بیچ ڈالنا [1] عورتوں پر کئے جانے والے بے انتہا مظالم کے نمونے ہیں۔عورتوں پر بالادستی اور تسلط جمانے والے مردوں یا عورتوں کو مطلق آزادی دینے والے معاشروں کی طرف سے مختلف صدیوں اور زمانوں سے آج تک جو مظالم عورتوں پر ڈھائے گئے ہیں اور ڈھائے جارہے ہیں، ان کو بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے بلکہ ہم اس مختصر تحریر میں صرف خلاصہ اور نمونہ کے طور پر اسلام میں

عورت کی قدر و منزلت اور تجدید حیات اور حیات بخش مکتب اسلام میں اس کے حقوق کے تحفظ کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

(۲)۔ جزیرۃ العرب میں مکتب اسلام کے طلوع وظہور کے ساتھ، اسلامی تعلیمات اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام کی برکت سے عورت کو اپنی شان کے مطابق قدر ومنزلت ملی اور وہ کھوئی ہوئی حقیقی حیثیت کے دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:
اسلام مرد اور عورت دونوں کی رشد و بالیدگی چاہتا ہے، اسلام نے عورتوں کو زمانہ جاہلیت کی لعنتوں سے نجات دلائی ہے اسلام نے جس قدر عورتوں کی خدمت کی ہے خدا جانتا ہے کہ اس قدر مردوں کی خدمت نہیں کی ہے۔[2] اسلام نے عورتوں کو مردوں کے مساوی قرار دیا ہے لیکن کچھ خاص احکام مردوں سے منسوب ہیں اور کچھ خاص احکام عورتوں سے منسوب ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں کے درمیان فرق کیا ہے۔[3]

(۳)۔ تخلیق میں یکسانیت: قرآن مجید عورتوں اور مردوں کو انسان کے دو گروہ جانتا ہے جو ایک گوہر و جان سے پیدا کئے گئے ہیں قرآنی تعلیمات کے مطابق انسانیت ایک نوع ہے اور مرد اور عورت دونوں مساوی و برابری کے حقدار ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے:

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا ...[4]

اس نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے اور پھر اسی سے اس کا جوڑا قرار دیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا [5]

اسی خدا نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے اور پھر اس سے اس کا جوڑا

قرار دیا ہے

(۴)۔اسی طرح اہم ترین انسانی خصوصیات، یعنی استدلال اور عقلمندی میں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور دونوں ان خصوصیات سے مساوی طور پر استفادہ کرتے ہیں:

هُوَ الَّذِیٓ اَنۡشَاَ کُمۡ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ؕ [6]

آپ کہہ دیجئے کہ خدا ہی نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی نے تھارے لئے کان آنکھ اور دل قرار دیئے ہیں۔۔۔۔

مسلمان مفسرین اور دانشوروں نے مذکورہ آیہ شریفہ میں اَفئد ۃ کے معنی اندیشہ (غور وفکر) بتائے ہیں، یہ (غور وفکر) وہ چیز ہے جو انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔[7]

(۵)۔ازدواجی زندگی میں مرد اور عورت کے حقوق میں فرق نہ ہونا،قرآن مجید میں عورت کے حق میں جس اقتدار، تسلط اور امتیاز کا خیال رکھا گیا ہے، وہ اس کے برابر ہی ہے جس کا مرد کے حق میں لحاظ رکھا گیا ہے، اگر چہ ممکن ہے کہ بعض مصادیق میں کچھ فرق نظر آئے گا جیسے عورت کے نفقہ کا حق، جس کی رعایت کرنا مرد کیلئے ضروری ہے اور مردوں کے آرام وسکون کا حق جس کی پیروی عورت کے لئے ضروری ہے، کیونکہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے:

وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِیۡ عَلَيۡهِنَّ ۔۔۔[8]

اور عورتوں کے لئے ویسے ہی حقوق بھی ہیں جیسی ذمہ داریاں ہیں۔۔۔مفسرین نے اس آیت سے مردوں اور عورتوں کے حقوق مساوی ہونے کا نتیجہ اخذ کیا ہے۔[9]

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ایسا موقع نہیں پایا جاتا جس میں انسان کے ارادہ واختیار کے دائرہ سے خارج، واضح طور پر کسی حق کی برتری یا عطا کی گئی فضیلت کی درجہ

کے طور پر تعبیر کی گئی ہو، بلکہ لفظ درجہ یا درجات انسان کے اس دنیوی یا اخروی مقام و منزلت کی طرف اشارہ ہے جو اس کے ارادہ وعمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔[10]

لکل درجات مما عملوا [11] اور ہر ایک کے لئے اس کے اعمال کے مطابق درجات ہیں

(٦)۔ لفظ قوام اہل لغت کی نظر میں رسد رسانی، محافظت اور نگرانی کے معنی میں ہے۔ لفظ قیام کبھی محافظت اور اصلاح کے معنی میں آتا ہے اسی کے مطابق خداوند متعال کا کلام ہے: الرجال قوامون علی النساء [12] مرد عورتوں کے حاکم اور نگراں ہیں [13]، قام الرجل علی المرأة صانها و قام بشانها. مرد کا عورت پر قوام، یعنی اس کی حفاظت کی اور اس کے مسائل حل کئے [14]

قرآن مجید کے اکثر مفسرین نے بھی اہل لغت کے اس مشترکہ نظریہ پر اتفاق کرتے ہوئے، آیہ شریفہ الرجال قوامون علی النساء میں لفظ قوام کے معانی سرپرست، نگران اور رسد رسان بتائے ہیں۔ نمونہ کے طور پر دو مثالوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے: قوام، اس شخص کا نام ہے جو سنجیدگی کے ساتھ کوئی کام انجام دیتا ہے، جب کہا جاتا ہے کہ یہ عورت کا قَیِّم ہے اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو اس کا کام انجام دیتا ہے اور اس کی رکھوالی کرتا ہے۔ لفظ قَیِّم اس شخص کے معنی میں ہے جو کسی دوسرے کے لئے کوئی کام انجام دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور لفظ قوام اور قیام اس معنی میں مبالغہ ہے۔[15]

(٧)۔ اس بنا پر اور اسلام میں عورت کے مقام و منزلت اور لفظ قوام کے بیان شدہ معنی کے پیش نظر آیہ شریفہ الرجال قوامون علی النساء سے یہ مطلب حاصل کیا جاسکتا ہے کہ یہ آیت خاندان میں ایک واحد رہبری و سرپرستی کو بیان کرتی ہے جو صلاح، مشوروں اور ذمہ داریوں کے پیش نظر ضروری ہے، نہ کہ یہ عورتوں کے بارے میں ظلم، تسلط،

اور زور زبردستی کی دلیل ہے[16]

چونکہ خاندان معاشرہ کا ایک چھوٹا یونٹ ہوتا ہے، قدرتی بات ہے کہ وہ ایک بڑے معاشرے کے مانند ایک رہبری اور سرپرستی کا محتاج ہے، اس لئے بعض وجوہ اور مردوں میں پائی جانے والی بعض خصوصیات کے پیش نظر یہ ذمہ داری مرد پر رکھی گئی ہے، مرد کی ان خصوصیات میں جذبات پر اس کا فکری غلبہ، خاندان کے تقدس کا دفاع کرنے میں اس کی جسمانی قوت ار بیوی بچوں کی زندگی کے مالی ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ داری وغیرہ شامل ہے

لیکن ممکن ہے بعض ایسی عورتیں بھی ہوں جو مذکورہ خصوصیات میں مردوں برتی رکھتی ہوں، لیکن قوانین میں جزئی اور استثنائی واقعات وحوادث کو مدنظر نہیں رکھا جاتا ہے بلکہ نوع اور کلی کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کا شک وشبھہ نہیں ہے کہ کلی طور پر عورتوں کی بہ نسبت مردوں میں خاندان کی سرپرستی کی ذمہ داری انجام دینے کی زیادہ صلاحیت اور آمادگی پائی جاتی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عورتوں پر مردوں کی برتری کے بارے میں سوال کیا گیا، تو آنحضرت نے فرمایا: کفضل الماء علی الارض فبا لماء تحیٔ الارض و بالرجال تحیٔ النساء ثم تلا ہذہ الآیۃ الرجال قوامون علی النساء[17] مرد کی عورت پر فضیلت، پانی کی زمیں پر فضیلت کے مانند ہے، پانی سے زمیں زندہ ہوتی ہے اور مردوں سے عورتوں کی زندگی میں نشاط وشادمانی پیدا ہوتی ہے اس کے بعد آنحضرت نے آیہ شریفہ الرجال قواموں علی النساء کی تلاوت فرمائی۔ اس سلسلہ میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: من سعادۃ الرجل ان یکون القیم علی عیالہ[18] خاندان کی سرپرستی مرد کی سعادت کی علامت ہے

مذکورہ دو روایتوں کے مطابق اگر سرپرستی کی ذمہ داری خاندان میں دوستی کے ماحول میں انجام پائے تو زندگی کے لئے نشاط وشادمانی اور شادابی وسلامتی کا سبب بن سکتی

ہے۔

(۸)۔ مردوں کی عورتوں پر سرپرستی کے مسئلہ کے بارے میں دو مختلف نظریئے پائے جاتے ہیں:

(الف) ایک نظریہ کے مطابق گھر کی چار دیوار کے اندر مردوں کی عورتوں پر حکمرانی اور سرپرستی مردوں میں جنسیت کے لحاظ سے پائی جانے والی خصوصیات کے پیش نظر ہے، یعنی زندگی کو بہتر طریقے پر چلانے کے لئے، ضروری ہے کہ مردوں اور عورتوں میں سے ہر ایک اپنی استعداد کے مطابق ایک خاص ذمہ داری کو سنبھالیں اور س لحاظ سے شوہر، بیوی کا سرپرست ہوتا ہے اور خانداں کے نظام میں سرپرستی کا حق مرد کو ہے [19]

بہرحال خالق کائنات نے لوگوں کو مختلف لیاقتوں اور گونا گوں صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اگر تمام لوگ ایک ہی قسم کی صلاحیتوں اور لیاقتوں کے مالک ہوتے تو ہستی کا نظام درہم برہم ہوجاتا، کیونکہ دنیا کے کام مختلف ہیں اور مختلف کاموں کے لئے مختلف صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا صلاحیتوں میں فرق ہونا ضروری ہے، عورت اور مرد کے درمیان فرق اسی لحاظ سے ہے، لیکن یہ فرق مرد اور عورت میں سے کسی ایک کے لئے برتری اور فضیلت کا معیار نہیں ہے، جب مرد اور عورت ایک دوسرے کے مقابل میں دو صنفوں کے عنوان سے ہوں تو اس صورت میں مرد ہرگز عورت کا قیم نہیں ہے اور عورت بھی مرد کے تسلط میں نہیں ہے، اس لئے ان دو کے درمیان موجود فرق برتری کا سبب نہیں ہے اور امتیاز و برتی کا سبب ان کے درمیاں موجود فرق نہیں بن سکتا ہے، اس لئے اس نظریہ کے مطابق سورہ نساء کی چونتیسویں آیت ایک فریضہ بیان کرتی ہے جسے مردوں کے ذمہ رکھا ہے نہ کہ کسی مقام و منزلت، معیار اور فضیلت کو بیان کرتی ہے۔[20]

(ب) اس موضوع کے سلسلہ میں دوسرا نظریہ، یہ ہے کہ مرد عورتوں پر بالادستی اور

حکمرانی رکھتے ہیں اور یہ حکمرانی صرف شوہر کی اپنی بیوی کی نسبت نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا حکم ہے جو مردوں کی نوع پر عورتوں کی نوع کے سلسلہ میں صادر ہوا ہے، لیکن عمومیت کے لحاظ سے کہ تمام مرد عورتوں کی صنف پر حکمرانی رکھتے ہیں، یہ حکمرانی حکومت اور عدلیہ کے مانند ہے کہ ایک معاشرہ کی زندگی اس سے وابستہ ہے، ان دو ذمہ داریوں کا قوام استدلال کی طاقت پر ہے کہ قدرتی طور پر یہ طاقت عورتوں کی نسبت مردوں میں زیادہ اور قوی تر ہے۔[21] لیکن اس نظریہ کے مطابق عورتوں پر مردوں کی سرپرستی کے معنی عورتوں کو آزادی اور ان کے انفرادی اور اجتماعی حقوق سے محروم کرنا نہیں ہے۔

(۹) سرانجام، مردوں کی سرپرستی کے بارے میں کہنا چاہئے کہ: یہ سرپرستی ازدواجی زندگی کے نظم و انتظام کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، جس نے مرد کو عورتوں کے امور کا ذمہ دار بنایا ہے، مرد خاندان کے مالی امور کا ذمہ دار ہے اور اس میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کے پیش نظر وہ مختلف حالات سے مقابلہ کرنے کی زیادہ طاقت رکھتا ہے مرد کو یہ ذمہ داری سونپنا اس کے لئے کسی بھی دنیوی یا اخروی فضیلت و برتری کا سبب نہیں بن سکتا ہے، کیونکہ اسلام کمال اور عروج کی راہ میں مرد اور عورت کے درمیان کسی فرق کا قائل نہیں ہے۔ کمال اور عروج کی راہ کو طے کر کے تقرب الٰہی حاصل کرنا عقل، تقوی اور عمل صالح کے ذریعہ ممکن ہے اور اس سلسلہ میں خداوند متعال کے ہاں برتری کا معیار صرف پرہیزگاری ہے نہ کہ جنسیت۔ اس لئے قرآن مجید کے نزدیک مرد کی سرپرستی میں کسی قسم کے تسلط، ظلم اور زیادتی کی گنجائش نہیں ہے اور یہ وہم و گمان کہ مذکورہ آیت مردوں کے عورتوں پھ تسلط کا باعث ہے، شائد قرآن مجید کی بحث و تحقیق میں لفظ قوام کے صحیح معنی بیان نہ کئے جانے کی وجہ سے ایجاد ہوا ہے۔

حواشی:

[1] پژوہش ہای قرآنی،ش، ۲۵، ۲۶، بھار وتابستان، ۱۳۸۰، بہ نقل ال المرأۃ فی التاریخ و الشریعۃ، احمد حمرانی،ص ۲۰۔

[2] صحیفہ نور، ج ۳،ص ۸۲۔ [3] ایضا، ج ۴ ص ۶۰۔

[4] سورہ زمر۔۶۔ [5] سورہ اعراف۔ ۱۸۹

[6] سورہ ملک۔ ۲۳۔

[7] ابن خلدون،عبدالرحمن،مقدمہ ابن خلدون ج ۲،ص ۸۶۰۔

[8] سورہ بقرہ۔ ۲۲۸۔

[9] علامہ طباطبائی،تفسیر المیزان میں فرماتے ہیں: اجتماعی عدالت کے مطابق مساوی کی جوتفسیر کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ معاشرہ میں ہرصاحب حق کواپنا حق ملنا چاہیئے اور ہرشخص اپنی وسعت اور استعداد کے مطابق آگے بڑھے، نہ کہ اس سے زیادہ پس مختلف افراد اورطبقات کے درمیان مساوی کے معنی یہی ہیں کہ ہر صاحب حق اپنے حق کو پالے، بغیراس کے کہ کسی کی حق تلفی کی جائے، اور یہ وہی جملہ ہے کہ فرمایا گیا ہے: و لھن مثل الذین علیھن بالمعروف و اللرجال علیھن درجۃ۔۔۔(تفسیر المیزان، ج ۲،ص ۲۶۸، ۲۹۷) اس سلسلے میں اہل سنت کا نظریہ جاننے کے لئے ملاحظہ ہو: ابن کثیر،تفسیر القرآن العظیم، ج ۳،ص ۵۰۶۔رشید رضا،تفسیر المنار، ج ۲،ص ۲۶۸۔۔ ۲۹۷۔

[10] پژوہش ہای قرآنی،ش، ۲۵، ۲۶،سال ۱۳۸۰،ص ۱۰۳۔

[11] سورہ انعام۔ ۱۳۲۔ [12] سورہ نساء۔ ۳۴۔

[13] ابن منظور،لسان العرب، ج ۱۱،کلمہ،قوم۔ [14] سعید الخواری، اقرب الموارد،کلمہ قوم۔

[15] طباطبائی،محمد حسین، المیزان، (ترجمہ فارسی)، ج ۴،ص ۵۴۲۔

[16] تفسیر نمونہ، ج ۳،ص ۴۱۱۔۔ ۴۱۶۔ [17] کاشانی،فیض،تفسیر صافی، ج ۱،ص ۴۴۸۔

[18] وسائل الشیعہ ، ج ۱۵۔ص ۲۵۱۔ [19] تفسیر نمونہ، ج ۳،ص ۳۷۰۔۔ ۳۷۱۔

[20] جوادی آملی،عبداللھ ، زن درآئینہ جلال و جمال،ص ۳۶۴۔۔ ۳۶۹۔

[21] طباطبائی، سید محمد حسین،، المیزان، ج ۴، ذیل آیہ ۳۴ سورہ نساء،ص ۳۴۳۔۔ ۳۴۷۔

جس قرآن نے اپنے نزول کے 23 سال کے اندر ہی اپنی آیتوں کی نفی و ترمیم کی ہو وہ کس طرح ہمیشہ کے لئے انسان کا راہنما ہوسکتا ہے؟

مختصر جواب:

قرآن اپنی شہادت کے مطابق ایسی کتاب ہے جو عالم گیر ہے [ذکری للعالمین] اور کسی زمانے یا جگہ یا کسی قوم سے مخصوص نہیں ہے: [نذیراً للبشر]۔

جو آیات اللہ کی طرف سے اس میں نازل ہوئی ہیں وہ اس طرح کی ہیں کہ جو تاریخ کے ہر موڑ پر اور ہر زمانے میں انسانی ہدایت کی ضرورتوں کو پورا کریں گی اور ان کی ہدایت کے لئے چراغ کی طرح جلتی رہیں گی اور انسانیت اس کے معارف کے چشمہ سے سیراب ہوتی رہے گی۔

چونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی آخری پیغمبر اور اسلام بھی آخری اور مکمل دین ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی پیغمبر نہیں بھیجا گیا اور اسلام دین خاتم ہے۔ خاتمیت خود قرآن کی جامعیت اور جاودانگی پر دلیل ہے۔

قرآن کی تاریخ اور تفسیر بھی اس بات کی شاہد ہے کہ قرآن کی برکت سے ہی ہر

زمانے میں دانشوروں کے لئے معارف نو کے دریچے کھلے ہیں اورقرآن نے انسان کی عبوری اورابدی دونوں طرح کی ضرورتوں کو پورا کیا ہے۔ البتہ یہ کام کلیات اوراصول ہدایت کو بیان کرنے اورعلم و اجتہاد کے ماہرین کے ذریعہ اصول سے فروع کو حاصل کرنے کے راستہ انجام پایا ہے۔

یہ جو آپ نے کہا ہے کہ قرآن نے بارہا اپنی آیات کی نفی وترمیم کی ہے،تو اس کا کوئی درست مفہوم نہیں ہے؛ کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن کی کوئی آیت کسی دوسری آیت کی نفی نہیں کرتی اوران میں کسی طرح کا تناقض،ٹکراؤاور باطل راہ نہیں پا سکتا۔ممکن ہے اس جملہ سے آپ کی مراد یہ ہو کہ قرآن میں نسخ پایا جاتا ہےلیکن یہ خیال رکھنا چاہئے کہ قرآن میں نسخ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ آیت دوسری آیت کی نفی یا اس میں ترمیم کررہی ہے؛ چونکہ نسخ کا مطلب یہ ہے کہ شروع سے ہی اس آیت کا حکم وقتی اورعبوری تھا اور جب اس کا وقت ختم ہوگیا تو دوسرا حکم آ گیا، نہ یہ کہ شروع میں حکم ابدی تھا بعد میں اس کے اندر ترمیم کی گئی۔ لہٰذا اگر ظاہری اعتبار سے کچھ آیتوں میں تناقض یا تضاد پایا جاتا ہوتو یہ ظاہری اور عام نگاہ میں ہے۔ اور چونکہ قرآن کی بعض آیتیں دوسری آیتوں کی تصدیق کرتی ہیں لہٰذا مفسرین کے بیان سے ان کا تضاد وتناقض ختم ہوجاتا ہے۔

تفصیلی جواب

قرآن جیسا کہ وہ خود ہی شہادت دیتا ہے، ایک عالمگیر اور ہمیشگی کتاب ہے اور انسان کی ہر موقع و مقام کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے نیز نہ کسی نژاد سے مخصوص ہے اور نہ ہی کسی طرح کے آداب ورسوم سے [**ذکری للعالمین**][1]۔ [**نذیراً للعالمین**][2]۔

اللہ نے قرآن کے معارف ومضامین کو اس طرح منتخب کیا ہے کہ تاریخ کے ہر موڑ اور ہر موقع و مقام پر تمام لوگ اس کے چشمہ معارف سے سیراب ہوسکتے ہیں۔قرآن اوراس

کی تفسیر کی تاریخ بھی اس بات تک پہنچاتی ہے کہ قرآن ہی کی برکت سے ہر زمانے میں دانشوروں کے لئے نئے معارف کے دروازے کھول گئے ہیں اور اس کے معارف کے چشمہ جوشاں نے ہر زمانے کی ضرورتوں اور سوالات کے جنگلوں کو سینچا ہے اور معارف الٰہی کے پیاسوں کو سیراب کیا ہے۔

قرآن کریم کی جامعیت، جاودانگی اور عالمگیری کے لئے بہت سے راستوں سے استدلال کیا جاسکتا ہے جن میں سے بعض کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جارہا ہے:[3]

۱۔قرآن اس سلسلہ میں فرماتا ہے [مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ][4] ہم نے قرآن میں کوئی چیز چھوڑی نہیں ہے۔ [اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ...][5] وغیرہ۔

یہ آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دین اسلام کامل ہوگیا ہے اور جو چیز کہی جانی چاہئے تھی اور جو احکام وقوانین انسان کے لئے بنائے جانے چاہئے تھے وہ تیار ہوچکے ہیں۔

۲۔ امام صادق علیہ السلام سے معارف قرآن کی تازگی اور جدیدیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: قرآن کی تازگی اس میں ہے کہ اللہ نے اسے کسی خاص زمانے یا خاص لوگوں کے لئے نہیں بھیجا اور وہ ہمیشگی اور ہر جائی ہے، اور ہر زمانے میں نیا ہے اور ہر طرح کے لوگوں کے درمیان قیامت تک شیریں ودلچسپ ہے۔[6]

۳۔خاتمیت، قرآن کی جامعیت اور جاودانگی پر دلیل ہے؛ کیونکہ انبیاء کے بھیجنے کا فلسفہ یہ تھا کہ اللہ وحی کے ذریعہ لوگوں کی ہدایت فرمائے اور عقائد، احکام وقوانین کے بیان کے ذریعہ انہیں ہدایت اور معنویت کے راستہ پر لگادے اور چونکہ انسان کی زندگی میں ہمیشہ تغییر وتبدل اور ترقی کمال ہے لہٰذا ایسا دین بھیجنے کی ضرورت تھی جو تمام انسانی ضرورتوں پر

مشتمل ہو،اس لئے خاتم الانبیاء اور نئے دین میں ایسی خصوصیت کا ہونا ضروری ہے جس سے نبوت، شریعت اور کتاب کی تجدید کی ضرورت نہ پڑے۔

دوسرے الفاظ میں: ہمیشہ کے لئے ہونا اور انسان کی ضروت ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ اس پر کبھی بھی کہنگی اور فرسودگی کا غبار نہ بیٹھے اور وہ ہمیشہ نیا اور تازہ رہے۔قرآن کے نا قابل استفادہ اور پرانا نہ ہونے کا راز یہ ہے کہ قرآن ایک تشریعی وجود ہے جو فطرت انسان کے تکوینی وجود سے ہم آہنگ ہے اور فطرت میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔

اس کے علاوہ قرآن ایسی کتاب ہے جو صرف عقائد و احکام، اقوام کے احوال، ہار جیت کے اسباب، امتوں کی تاریخ، جہان ابدیت کی توصیف اور خودسازی و انسان سازی کی راہ وصول بیان کرنے کی کتاب نہیں ہے بلکہ ہمیں ایسے راہنماؤں کی طرف لے جاتی ہے جو راستہ بھر لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ یہ اولیائے دین اور راسخون فی العلم ہیں جو آیات متشابہات کو آیات محکمات کے ذریعہ حل کر سکتے ہیں اور روش اجتہاد کی بنیاد ڈال کر ہر زمانے میں احکام مستحدثہ اور مسائل متغیرہ کا استنباط کر سکتے ہیں۔قرآن نے خاتمیت کے دور میں راسخون فی العلم کی طرف رجوع کو کہا ہے جو کلی منصوبہ کے ذریعہ امت کی راہنمائی کرتے ہیں اور زمان و مکان کے مطابق جزئی احکامات کی توضیح وتفسیر کرتے ہیں۔ اجتہاد کا یہی کردار ہے۔[7] لہٰذا ان علماء کا فریضہ یہ ہے کہ وحی کے ختم نہ ہونے والے منابع سے استفادہ کرتے ہوئے اور موضوعات احکام کے تغییر وتحول کے مدنظر کلیات کی تطبیق اور احکام کی تفسیر کریں، ہوسکتا ہے کوئی مسئلہ صدر اسلام میں درپیش نہ رہا ہو لیکن آج درپیش ہو اور ضروری سمجھا جارہا ہو۔علماء اور مجتہدین کے ذریعہ جزئیات کو کلیات پر منطبق کرکے اور استنباط کی روش کو اپنا کر نئی ضرورتوں کا جواب دیا جاتا ہے۔درحقیقت اجتہاد کا مطلب یہی ہے اور اگر قرآن نے ہر چیز کو الگ الگ ذکر کیا ہے اور ہر چیز کا بیان اس میں موجود ہے[8] تو اس کا مطلب بھی یہی

ہے۔

اس نسبتا طویل تمہید کے بعد اصل مسئلہ کو بیان کرتے ہیں۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن ظاہری لحاظ سے خوبصورت (فصیح و بلیغ) اور معنوی لحاظ سے موافق و ہم آہنگ ہے، اس طرح کہ کسی طرح کا اختلاف اور ناموافقت اس کے آیات و احکام میں نہیں پایا جاتا۔ قرآن کی کوئی آیت دوسری آیت کی نفی نہیں کرتی بلکہ بعض آیات دوسری آیات کی تصدیق کرتی ہیں اور کسی طرح کا تناقض اور باطل ان میں راہ نہیں پا سکتا[9] [کیا قرآن کے بارے میں نہیں سوچتے ہو؟ اگر اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو تم اس میں شدید اختلاف پاتے][10]۔

لیکن اگر نفی و ترمیم سے آپ کی مراد، نسخ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ لغت میں نسخ کے معنی زایل کرنے اور نابود کرنے کے ہیں، یعنی کسی چیز کو باطل کر کے اس کی جگہ کسی اور چیز کو لانا[11]۔ اور اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت اسلامی میں سے ایک ثابت شدہ حکم کو اٹھا لینا اور یہ اس کی میعاد (مدت) ختم ہونے کے سبب ہے۔[12]

قرآن کے بارے میں تین طرح کے نسخ کا تصور کیا جا سکتا ہے:

۱۔ حکم اور تلاوت دونوں نسخ ہو جائیں۔ یعنی قرآن کی ایک ایسی آیت نسخ ہو جائے جس میں احکام الٰہی میں سے کوئی حکم بیان کیا گیا تھا۔ یہ نسخ چونکہ تحریف قرآن کے معنی میں ہے لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے۔

۲۔ حکم کو نسخ نہ کیا جائے بلکہ صرف تلاوت نسخ ہو اس طرح سے کہ آیت کو ہٹا لیا جائے لیکن اس کا حکم باقی رہے۔ نسخ کی یہ قسم بھی مختلف وجوہات کے سبب ممکن نہیں ہے۔

۳۔ حکم نسخ ہو جائے لیکن تلاوت برقرار رہے۔ نسخ کی یہ قسم ممکن ہے اور قرآن میں واقع بھی ہوئی ہے اور تمام مفسرین نے اس کو قبول کیا ہے۔

البتہ یہ نسخ نہ تو تناقض کلام ہے اور نہ ہی اختلاف نظر اور نہ ہی نظر ثانی بلکہ ایک حکمی اختلاف ہے جو مصداق کے سبب وجود میں آیا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ایک مصداق کسی خاص حالت میں ایک خاص مصلحت رکھتا ہو لہذا اس کے لئے ایک خاص حکم آئے گا، اور پھر جیسے ہی وہ خاص مصلحت ختم ہوجائے تو وہ حکم بھی اٹھ جائے گا یعنی وہ پہلے سے ہی وقتی اور محدود مصلحت کا حامل تھا۔

قرآن کی بعض آیتیں مثلا سورہ نمل کی 101ویں اور سورہ بقرہ کی 106 و 107ویں آیتیں اسی بات کو بیان کرنا چاہتی ہیں۔[13]

البتہ نسخ کے فلسفہ کے بارے میں یوں کہنا بہتر ہوگا کہ قرآن کے نزول کا مقصد انسانی معاشرہ کی تعمیر ہے، انسانی معاشرہ ایک ایسے بیمار کے مثل ہے جو شفا کے نسخہ کا ضرورتمند ہے، ظاہرسی بات ہے کہ بیمار کی شفا کے لئے کبھی دوا کے بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن کریم بھی ان انسانوں کے لئے نسخہ شفا ہے جو جہل، غفلت، خودخواہی وغیرہ میں گرفتار ہیں اور معنوی حقائق اور اعلی انسانی صفات و کمالات سے لاعلم ہیں۔ ان بیماروں کی نجات کے لئے ایک ماہرانہ منصوبہ کی ضرورت ہے جو قدم قدم پر ان کی روح و جان کو اخلاقی پلیدیوں سے پاک کرکے ان کی جگہ اخلاقی کمالات کو جاگزیں کرتا رہے۔ نسخ ایک ایسے معاشرہ کے لئے اجتناب ناپذیر ہے جو پست اور گرے ماحول سے عالی اور بلند مرحلہ کی طرف ارتقا کررہا ہو۔ کیونکہ بہت سی جگہوں پر دفعی اور اچانک قسم کا کام ممکن نہیں ہوتا بلکہ زینہ بزینہ کام کرنا ہوتا ہے۔ لہذا معاشرہ کے پست ماحول سے عالی ماحول کی طرف جانے کے زمانے کی منسوخ آیتیں وقتی اور عبوری علاج کا حکم رکھتی ہیں۔[14]

لہذا ناسخ و منسوخ ظاہری لحاظ سے آپس میں منافات رکھتے ہیں لیکن درحقیقت ان میں کوئی تناقض اور ٹکراؤ نہیں ہے؛ کیونکہ دونوں ہی اپنی خاص مصلحت رکھتے ہیں، ناسخ میں

منسوخ سے بعد والی مصلحت ہے۔

قرآن کی آیات محکم و متشابہ بھی اسی طرح ہیں۔ جیسا کہ کہ قرآن خود فرماتا ہے کہ اس کی آیتیں محکمات و متشابہات پر مشتمل ہیں۔ ہوسکتا ہے بشر کی فکری نارسائی اور ماورائے طبیعت حقائق و معانی کی بلندی و برتری اسی طرح روزمرہ کی ضرورتوں کے لئے بنائے گئے الفاظ وعبارات کی نارسائی قرآن میں آیات متشابہ کے وجود کا سبب ہوں کیونکہ فطرتا ان الفاظ میں ان بلند معانی کو بیان کرنے کی گنجائش اور وسعت نہیں ہوتی۔[15]

انبیاء الٰہی درحقیقت دانا و نادان اور عقلمند واحمق ہر طرح کے انسان کے لئے مبعوث ہوئے بہت سے اعلی مفاہیم اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ ہر انسان انہیں نہیں سمجھ سکتا بلکہ صرف خاص افراد ہی ان کو درک کرسکتے ہیں۔ ان کا علم، راسخون فی العلم کے پاس ہے۔[16]

لہٰذا یہ ظاہری اختلافات اسی سبب ہیں اور یہ بات کسی طرح بھی آیات کے تناقض یا نفی وترمیم پر دلالت نہیں کرتی لہٰذا نتیجہ میں انجام تاریخ تک انسان کے لئے اس کی راہنمائی سے بھی منافی نہیں ہے۔

حواشی

[1] انعام، ۹۰۔

[2] مدثر، ۳۶۔

[3] مزید معلومات کے لئے: اشاریہ: قرآن میں رطب و یابس، سؤال ۱۳۵ سائٹ ۱۱۰۱

[4] انعام، ۳۷

[5] مائدہ، ۳

[6] بحارالانوار، ج ۸۹، ص ۱۵؛ نورالثقلین، ج ۳، ص ۲۰۷۔

[7] ایازی، سید محمد علی، جامعیت قرآن، ص ۵۱۔ جامعیت اور خاتمیت کے بارے میں مزید معلومات کے

لئے رجوع فرمائیں: خاتیمت ،مرتضی مطہری؛ خاتمیت از نظرقرآن و حدیث،جعفر،سبحانی؛ راہنما شناسی،محمد تقی،مصباح یزدی۔

[8] نحل،۸۹۔

[9] فصلت۔،۴۱۔۴۲۔ یہ شکست ناپذیر کتاب ہے جس میں نہ آگے سے نہ پیچھے سے کسی طرح کا باطل نہیں آسکتا چونکہ حکیم اور شائستہ حمد خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ علامہ طباطبائی کا نظریہ ہے کہ اس آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ احکام قرآن قابل تغییر نہیں ہیں اور نہ اس کے کسی حکم اٹھا کر اس کی جگہ کوئی اور حکم لایا جاسکتا ہے (درمحضر علامہ طباطبائی،محمد حسین رخشاد،ص ۲۷۶)

[10] قریشی، سید علی اکبر، قاموس قرآن، ج ۷، لفظ نسخ۔

[11] خوئی، سید ابولقاسم، البیان،ص ۲۷۷ ۔ ۲۷۸

[12] نساء، ۸۲۔

[13] ہم جس آیت کو نسخ یا ترک کرتے ہیں اس سے بہتر یا اسی طرح کی آیت لے آتے ہیں۔۔۔ بقرہ، ۱۰۶۔ دیکھئے: فخر رازی، التفسیر الکبیر، ج ۳ و ۴،ص ۲۲۶؛ تفسیر نمونہ، ج ۱۱،ص ۴۰۵، ج ۱،ص ۳۸۸۔ کچھ منسوخ آیتیں یہ ہیں: ۱۵و ۱۶ سورہ نساء جو سورہ نور کی دوسری آیت کے ذریعہ نسخ ہوئی ہیں؛ اسی طرح سورہ مجادلہ کی ۱۲ویں آیت جس میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ سے خلوت میں بات کرنے کے لئے صدقہ رکھا گیا ہے اور یہ آیت اسی سوری کی ۱۳ویں آیت کے ذریعہ منسوخ ہوئی۔

[14] احمدی، مہدی، قرآن،ص ۱۰۳۔ ۱۱۲۔

[15] ایضا۔

[16] آل عمران، ۷، نساء ۱۶۲۔